

الاوانگائے آئینہ

میرزا سزا پر مبنی پکی کہانیاں

ایکسٹریٹ سٹریٹ ڈائری

پہلی جلد



الاؤ انگلے آسچ

پہلا مجموعہ



جرم و سزا پر مبنی سچی کہانیاں



انسپکٹر (ریٹائرڈ) نواز خان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

مارچ ۱۹۸۶ء

بار اول

فہرست

۷	آخری کوشش
۳۹	الاؤانگارے آنج
۶۹	زرینہ کے لئے
۹۳	سیتا، سیٹھ اور کامنی
۱۱۷	اک مرلہ زمین
۱۳۹	سنہرے خواب

قیمت ————— ۲۰ روپے

ناشر : امجد روف خان سیارہ ڈائجسٹ
۱۸۹- ریواز گارڈن لاہور

طابع : اللہ والا پرنٹرز، شاہراہ قائد اعظم لاہور

پیش لفظ

جب سے بھولی بسری یادوں کو چھیڑا ہے، آنکھوں کے سامنے کہا نیوں کی ایک دُنیا آباد ہو گئی ہے۔ لانا دھندلے اور روشن چہرے نگاہوں میں گھوم رہے ہیں۔ ہر رنگ اور ہر وجہ کے چہرے، لاشوں کے چہرے، لاشوں پر کھڑے ہو کر قہقہے لگانے والوں کے چہرے، لڑنے والوں اور لڑ مرنے والوں کے چہرے، آنسو بہانے ہوئے معصوم بچوں کے چہرے، آنسو پیتے ہوئے مجبور بوڑھوں کے چہرے، مار کھا کر پیچھے والے مجرموں کے چہرے، عزت ٹٹا کر لوٹنے والی عورتوں کے چہرے، حسین اور جوان چہرے، بد صورت اور ظالم چہرے، مشتبہ چہرے، ملتان قاتی چہرے، فریادی چہرے..... وہ بات کی زندگی میں کیا کچھ نہیں ہوتا اور ایک فرض شناس پولیس والے پر کیا نہیں بنتی؟ آج چہروں کی اس بھڑ میں سے چند چہرے میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ دیکھئے اور فیصلہ کیجئے آپ کا اپنا چہرہ کس چہرے سے ملتا ہے۔

انتساب

اپنے نوجوان دوست طاہر جاوید مُغل کے نام

کچھ کتاب کے بائے میں

ہر عہد میں مجرم و سزا کے مسئلے پر غور و فکر ہوا ہے۔ مجرم کیا ہے؟ مجرم کون ہے؟ اور اسے سزا کون دے گا؟ دنیا بھر کے ذخیرہ نثر میں سب سے زیادہ اسی موضوع پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔

نوسکو و ہسکی ہو یا آسکر و آملڈ، سلمان رشدی ہو یا امٹر کمال مجرم و سزا ان کی تحریروں کا ایک لازمی حصہ ہے۔ یہ کتاب بھی اسی نوعیت کی ایک کوشش ہے اور مجھے امید ہے کہ اسے خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوگی۔

منتصر حسین تارڑ

آخری کوشش

گر میوں کے دن تھے۔ گندم کی کٹائی ہو رہی تھی۔ دیہات کی فضا میں کچی ہوئی فصل کی خوشبو رچی تھی۔ ایک رات کھانا وغیرہ کھا کر میں چیت پر آیا تو ہوا بالکل تھمی ہوتی تھی۔ کہیں درخت کا کوئی پتہ بھی نہیں ملتا تھا۔ مارے دن کے تھکے ہارے لوگ کھانا کھاتے ہی سونے کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہلکی ہلکی ہوا چلنی شروع ہوئی۔ بچانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ رات کسی پہر شور سن کر میں جاگ اٹھا۔ قریب ہی میرے بیوی بچے بے خبر سوتے ہوئے تھے۔ میں نے ارد گرد دیکھا اور تب مجھے احساس ہوا کہ کچھ عجیب طرح کی روشنی در و دیوار پر پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے چونک کر شمال کی طرف دیکھا۔ دو رکھیتوں کے درمیان آگ کا ایک بڑا الاؤ نظر آ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں دیہاتی لاٹھیاں سنبھالے کھیتوں کی طرف بھاگتے دکھائی دے رہے تھے۔ اب میری بیوی بھی جاگ گئی تھی اور حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ میں نے نیکی کے نیچے سے اپنا ریلو اور نکالا اور سیڑھیاں

لگایا تھا کہ لڑکی خوبصورت ہونے کے ساتھ نیکہ سیرت اور باوقار بھی ہے۔
 غیر لڑکی کا تذکرہ تو یونہی درمیان میں آگیا۔ میں بات کر رہا تھا گندم کو لگائی جانے والی آگ کی۔ اگلے روز ریاست گاؤں کے نمبردار اور چند دوسرے افراد کے ساتھ پرچہ کٹانے کے لئے تھانے آیا۔ اُس بیچارے کی حالت بہت تپتی ہو رہی تھی۔ خون پسینے سے سیخی ہوئی فصل کسان کو بچوں کی طرح عزیز ہوتی ہے۔ اس نوجوان کے چہرے پر بھی وہی دکھ نظر آ رہا تھا جو جوان اولاد کی موت پر بد نصیب باپ کے چہرے پر دکھائی دیتا ہے۔ میں نے اُس سے مشکوک افراد کے بارے میں پوچھا تو اُس نے گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار پریم سنگھ اور اُس کے بیٹوں کے نام لکھوائے۔ کچھ دن پہلے ان لوگوں سے پانی کی باری پر ریاست علی کا جھگڑا ہوا تھا۔ بات بڑھ کر ہاتھ پائی تک پہنچی تھی اور ایک دو افراد کے سر بھی پھٹے تھے۔ اس روز میں نے پریم سنگھ اور اس کے بڑے بیٹے کو تھانے میں طلب کیا۔ پہلی نظر میں پریم سنگھ مجھے ایک لمبا ترنگا جھگڑا ہوا اور شرارتی سیکھ دکھائی دیا۔ ایک گھنٹے کی گفتگو میں میں نے ہر طرح انہیں کریدنے کی کوشش کی لیکن وہ اس واردات سے لاعلمی کا اظہار کرتے رہے۔ بہر حال پریم سنگھ سے ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ اُس نے بتایا چند روز پہلے ایک اور شخص سے بھی ریاست کا جھگڑا ہوا تھا۔ یہ نوجوان ریاست کا خالہ زاد بھائی مراد ہے اور اس قصبے میں رہتا ہے۔ سنا ہے کہ وہ ریاست کی بہن شادو کے عشق میں مبتلا ہے وہ اکثر اُن کے گھر آتا جاتا رہتا تھا لیکن کچھ عرصے سے اُس کا آنا جانا بند ہو گیا ہے۔ پریم سنگھ نے بتایا کہ ایک روز شادو بھائی کے لئے کھیت میں روٹی لے کر آئی تو مراد بھی وہاں آ گیا۔ تھوڑی دیر وہ تینوں بیٹھے رہے پھر اچانک اُن کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لڑکی

بھلا لگتا ہوا نیچے آگیا۔ جونہی میں گھر سے نکل کر گلی میں پہنچا ایک بھاری بھر کم شخص بناگتا ہوا مجھ سے ٹکرایا۔ میں فوراً پہچان گیا۔ وہ میرا مجر بلال شاہ تھا، لیکن بلال شاہ نے مجھے نہیں پہچانا۔ وہ تیر کی طرح سیدھا کھلتا چلا گیا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر جائے حادثہ کی طرف روانہ ہو گیا جس وقت میں کھیتوں میں پہنچا آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ کسی شقی القلب نے گندم کی کٹی ہوئی فصل کو آگ لگا دی تھی فصل کا مالک ریاست نامی ایک نوجوان تھا۔ وہ اپنی بربادی کا منظر دیکھ کر دیوانوں کی طرح بال فروغ تھا۔ کچھ لوگوں نے اُسے بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا اور حوصلہ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ موقع پر پہنچنے والے دیہاتی آگ سے بچی ہوئی گندم کو جلتی ہوئی گندم سے علیحدہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھے، لیکن آگ اتنی تیزی سے پھیلی تھی کہ وہ چند گھنٹے سماتنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ ذرا سی دیر میں ایک کسان کی سال بھر کی محنت جل کر راکھ ہو گئی۔

ریاست نامی جس نوجوان کی فصل کو آگ لگائی گئی وہ گاؤں کا ایک خوشحال اور غنی کاشتکار تھا۔ کوئی دو سال پہلے اُس کا باپ فوت ہوا تھا۔ دو مریضے زمین اُس کے حصے میں آئی تھی وہ خود ہی اس کو کاشت کر کے اپنی بوڑھی ماں اور جوان بہن کی کفالت کرتا تھا۔ میں اُن دنوں رام پورہ تھانے میں نیا نیا آیا تھا اور ریاست وغیرہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن میں نے لوگوں سے سُن رکھا تھا کہ ریاست کی بہن بڑی خوبصورت ہے۔ میرے مجر بلال شاہ نے بھی شاید ایک دو بار اس کا تذکرہ کیا تھا بلال شاہ اس قسم کے قصے بڑے مزے لے کر اور تفصیل سے سُنایا کرتا تھا۔ لیکن اس لڑکی کے بارے میں اُس نے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی تھی۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ

خاموش بیٹھی تھی اور وہ دونوں زور زور سے بول رہے تھے۔ مراد کی آواز سنائی دی وہ جاتے جاتے کہہ رہا تھا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تم سب پر اور یاد رکھنا اس بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ بلال شاہ حسب معمول اُونچی آواز میں بولتا ہوا اُٹھانے میں داخل ہوا۔ وہ بڑی روانی سے کسی کو صلوٰۃ میں سنا رہا تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ رات جب میں گلی میں نکلا تھا تو بلال شاہ میرے ساتھ ٹکرایا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے میں داخل ہوا۔

”خان صاحب! رات تو پڑھا ہی ہو گیا“ وہ دھم سے کمری پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
”اب ذرا اس پیڑے کی تفصیل بتا دو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کے بعد بلال شاہ نے ہاتھ نچا نچا کر اپنے مخصوص ڈرامائی انداز میں جو طویل کہانی سنائی اس کا لب لباب یہ تھا کہ رات جب آگ لگی بلال شاہ دوڑتا ہوا موقع پر پہنچا۔ اُس نے وہاں ایک شخص کو افراتفری میں بھاگتے ہوئے دیکھا۔ بلال شاہ ”ناؤ گیا کہ یہ شخص مجرم یا مجرموں کا ساتھی ہے۔ اُس نے فوراً اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ وہ شخص گاؤں کے اندر سے ہوتا ہوا پرلی جانب نکل گیا۔ بلال شاہ کے مطابق یہ تعاقب کم و بیش دو میل تک جاری رہا اور بلال شاہ کا پیڑا ہو گیا۔ لیکن مکمل ”پیڑا“ اُس وقت ہوا جب بھاگتے والا شخص مجرم کی بجائے بلال شاہ کا ایک لگوٹیا یا رنگلا گاؤں سے باہر ایک ویران جگہ جا کر وہ کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مانپتے کا نپتے بلال شاہ نے اُسے پکڑ لیا اور تب اُسے پتہ چلا کہ یہ اُس کا دوست شیدا کہتا ہے جو اپنے مفروضہ

گدھے کے پیچھے نکلا ہوا ہے۔ دراصل جس وقت آگ بھڑکی قریب ہی بندھا ہوا شیدے کا گدھا رستی تڑوا کر بھاگ نکلا۔ اب گاؤں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر گدھا اُسے جل دے کر کہیں غائب ہو گیا تھا اور وہ ہونکوں کی طرح مُنہ اُٹھاتے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ قصہ مختصر شیدے نے بلال شاہ کو گدھے کی تلاش میں اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ ایک اور دو گیارہ ہوتے ہیں۔ کئی ناکام چھاپوں کے بعد رات کوئی ایک بجے انھوں نے گدھے کو پھڑپھڑایا اور گھسیٹتے ہوئے گاؤں واپس لائے۔ اس سارے واقعے میں میرے لئے صرف ایک کام کی بات تھی اور وہ تھی شیدے کھمار کی موقع پر موجودگی۔ بلال شاہ کی بات سے ظاہر تھا کہ شیدا بالکل ابتدائی لمحوں میں موقعہ و اوقات پر موجود تھا۔ میں نے اُسے اُٹھانے بلوایا وہ بہت سہما ہوا تھا۔ وہ مجرموں کی تو کوئی نشاندہی نہ کر سکا لیکن مجھے احساس ہوا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے سوالوں کے جواب میں اُس نے بتایا کہ وہ آج کل کھیتوں میں کوڑا کرکٹ ڈال رہا ہے۔ کل رات اُس کے گدھے ریاست کے کھیتوں ہی میں بندھے ہوئے تھے۔ یہاں تک پہنچ کر شیدا ایک بار پھر بچکچکانے لگا۔ میں نے اُسے تھوڑا سا حوصلہ دیا تو وہ بولا۔

”تھانیدارجی۔ میں ریاست اور اُن کے گھروالوں کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ اپنی شادوبنی بی بھی بڑی نیک اور سمجھ دار ہے۔ لیکن ایک لڑکا اُسے چکر دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔“

”ساری بات کھول کر بتاؤ۔ کون لڑکا ہے وہ؟“ میں نے ذرا تمسکا نہ لیمے میں کہا۔
”جی.... مراد نام ہے اس کا۔ ان لوگوں کا کوئی رشتہ دار ہے،“ پھر ذرا رک

کر بولا ”سرکار کل رات میرے جانور ریاست کے کھیتوں ہی میں بندھے ہوئے تھے۔ ریاست اور اس کا ایک ساتھی گندم کے پاس ہی چار پائیاں ڈال کر سوتے تھے۔ کل رات ریاست کی ماں تو اس کے پاس ہی بیٹھ گئی لیکن شادو اپنی ایک سیہلی کے ساتھ گندم کے گٹھوں کے قریب بیٹھ گئی۔ گٹھوں کے دوسری طرف میری چار پائی تھی۔ اور میں دونوں لڑکیوں کی آوازیں صاف سن رہا تھا۔ شادو کی سیہلی بار بار اس سے کوئی بات پوچھ رہی تھی۔ پھر شادو نے بتایا کہ کل مراد کے ساتھ اس کا جھگڑا ہو گیا ہے۔ دراصل مراد چاہتا تھا کہ شادو رات کے وقت اسے ”جامنوں والے باغ“ میں لے۔ شادو نے جواب دیا کہ تباہی لڑکی کی شادی ہونے والی ہے۔ وہاں جی بھر کر باتیں کر لینا۔ مراد اپنی ضد پر اٹھارہ۔ شادو نے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ اپنے بھائی کی عزت خطرے میں ڈال کر اس سے ملنے نہیں آسکتی۔ اس بات پر مراد ناراض ہو گیا۔ اور اسے برا بھلا کہہ کر چلا گیا۔ اب شادو کی سیہلی اسے مشورہ دے رہی تھی کہ وہ مراد کو منالے، لیکن شادو کا کہنا تھا کہ وہ بڑے غصے میں گیا تھا۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے دونوں سیہلیاں کافی دیر وہاں بیٹھی مراد کی باتیں کرتی رہیں۔ آخر شادو کی ماں نے آواز دی اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

میں بڑے غور سے شیدے کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ آگ کی واردات میں مراد پر شک کیا جاسکتا ہے۔ اس سے پہلے پریم سنگھ نے بتایا تھا کہ مراد نے ریاست کو دھمکی دی تھی۔ اب پتہ چلا تھا کہ آگ لگنے سے صرف ایک روز پہلے ریاست کی بہن سے اس نے جھگڑا کیا تھا۔ اس پورے معاملے کو سمجھنے کے لئے مجھے مراد اور شادو کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی

ضرورت تھی۔ میں نے مراد کو بلانے کے لئے اسے ایس آئی گو بندر کو بھیجا لیکن پتہ چلا کہ وہ بیچ خریدنے کے لئے شہر گیا ہے۔ وہاں اسے ایک سیہلی بھی بھگتنی ہے۔ ایک ہفتے سے پہلے اس کے آنے کی امید نہیں۔ شادو کے بارے میں جاننے کے لئے میں نے گاؤں کی دانی ”بھاگاں“ سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ بھاگاں ایک قابل اعتماد عورت تھی اور اس سے پہلے بھی میرے کئی کام کر چکی تھی۔ اس نے چند روز میں ہی مجھے مطلوبہ معلومات ہم پہنچا دیں۔

اس نے بتایا کہ ریاست کی بہن شادو اور مراد ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ بچپن سے ان کے رشتے کی بات چل رہی ہے لیکن ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ پھر عرصے سے دونوں گھروں کے تعلقات خراب ہو گئے ہیں اور اب ان کا رشتہ ہوتا نظر نہیں آتا۔ سب سے بڑی رکاوٹ ریاست کی ہے۔ وہ اس رشتے کے حق میں نہیں۔ اس کی ماں اپنی بہن کو لڑکی دینا چاہتی ہے لیکن بیٹے کی وجہ سے مجبور ہے۔ بچاری لڑکی دو گھرانوں کی لڑائی میں خواہ مخواہ پس رہی ہے۔ وہ اپنے تایا زاد سے محبت کرتی ہے۔ بہن دل کی بات زبان پر نہیں لاسکتی۔ وہ بڑی سمجھدار اور ماں باپ کی عزت رکھنے والی لڑکی ہے۔ دانی بھاگاں نے بتایا کہ شہر کے جھگڑے نے وہاں کو متاثر کیا ہے۔ ہر وقت گم سم سی رہتی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ریاست نے شہر کی محبت اب ہے۔ فصل کے نقصان نے اس کی مکر ٹوڑ دی ہے۔ اور پہلے والی خوشحالی ان کے گھر میں کہیں نظر نہیں آتی۔

چند روز گزر گئے۔ میں نے کئی مشکوک افراد سے پوچھ گچھ کی لیکن آگ لگانے والوں کوئی سراغ ہاتھ نہیں آیا۔ مراد بھی ابھی تک گاؤں واپس نہیں آیا تھا۔ اس اثنا میں

میرے تھانے کے ایک دوسرے موضع میں قتل ہو گیا اور میں اس زیادہ اہم کمپس کی تفتیش میں لگ گیا۔ قریباً دو ہفتے بعد کا واقعہ ہے۔ میں صبح تھانے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ باہر صحن میں کسی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ چند لمحوں بعد اے ایس آئی گویند ایک نحیف و لاغر بڑھیا کو بازوؤں سے تھامے اندر داخل ہوا۔ چند اور افراد بھی اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ بڑھیا زار و قطار روتے ہوئے کسی کو کوسنے لگی رہی تھی۔ اے ایس آئی گویند نے بتایا کہ یہ ریاست کی ماں ہے رات اُن کے گھر میں چوری ہو گئی ہے۔ بڑھیا زمین پر بیٹھ گئی اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر میرے نام کی دہائی دینے لگی۔ پتہ چلا کہ چور دیوار پھاڑ کر اُس کی بیٹی کا سارا جہیز لے اڑے ہیں۔ میں نے اُسی وقت چند سپاہیوں کو ساتھ لیا اور بڑھیا کے ساتھ اُس کے گھر روانہ ہو گیا۔

جاتے واردات پر پہنچ کر میں نے موقع کا تفصیلی جائزہ لیا۔ چور پہلے صحن میں داخل ہوتے تھے۔ پھر انہوں نے ایک کمرے کی بغلی دیوار میں سوراخ کیا تھا اور وہاں سے سب کچھ نکال کر لے گئے تھے۔ ایک دو پارچہ جات ابھی تک صحن میں بکھرے ہوئے تھے۔ کمرے کے اندر ٹرٹک کھلے پڑے تھے۔ چند ایک کم قیمت چیزیں ہی اُن کے اندر باقی رہ گئی تھیں۔ ایک جانب زیور کے لئے استعمال ہونے والے سُرخ رنگا کے خالی ڈبے ناکام آرزوؤں کی کہانی سنارہے تھے۔ بڑھیا ابھی تک اُدنی آواز میں بین کر رہی تھی۔ ”خدا غارت کرے ان دشمنوں کو، ہمارا گھر برباد کر دیا۔۔۔۔۔“

پہلے فصل کو آگ لگائی پھر میری بیٹی کا جہیز لے گئے۔ اندر کے شام سے پہلے موت آئے اُن کو، ”ریاست اور ایک نوجوان لڑکی بڑھیا کو کندھوں سے پکڑے اند لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے لڑکی کی صرف ایک جھلک دیکھی اور

پہچان کیا کہ یہی شادو ہے۔ وہ واقعی بہت حسین تھی۔ سو گوارا نے اُس کے صحن کو عجیب طرح کی سنجیدگی دے دی تھی۔ میں نے اے ایس آئی گویند کی طرف دیکھا۔ وہ جاتے واردات کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف تھا۔ قصبے کے دو کھوجی بڑی احتیاط سے کھڑا ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے مکان کے محل وقوع کا جائزہ لیا۔ یہ گھر دائیں بائیں سے دوسرے گھروں میں گھرا ہوا تھا۔ سلسلے کی طرف سے کسی کے اندر گھسنے کا امکان بہت کم تھا۔ اس طرف گلی تھی اور گلی میں دیوار کے ساتھ ساتھ چار چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اگرچہ اس طرف سے صحن میں گھسنے کی کوشش کرتے تو کسی نہ کسی کو ضرور خبر ہو جاتی۔ چور یقیناً عقبی سمت سے اندر آئے تھے۔ میں چکر کاٹ کر مکان کے عقب میں پہنچا۔ چھت کے منڈھیر وغیرہ دیکھے وہ بالکل سلامت تھے۔ دیوار پر کسی قسم کا کوئی اور نشان بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہاں چند گز پیچھے زمین پر ایک خراش سی نظر آ رہی تھی۔ جیسے کوئی چیز گھسیٹی گئی ہو۔ تمام تفصیلات نوٹ کرنے کے بعد میں تھانے آ گیا۔ ریاست اور اُس کے ایک دُور کے رشتے دار بھی میرے ساتھ ہی تھانے آئے تھے۔ انہوں نے چوری کا پیرچہ درج کر دیا۔ جب میں نے ریاست سے مشکوک افراد کے بارے میں پوچھا تو وہ حسب سابق ایک بار تھوڑا سا ہنچکایا۔ پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے اُس نے طویل سانس لی اور بولا۔

”جناب! مجھے شک ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ واردات میرے تایا کے لڑکے مُراد نے کی ہے۔“

میرے ذہن سے مُراد کا نام بالکل نکل چکا تھا۔ میں نے ریاست سے پوچھا کہ یہ لڑکا ابھی گاؤں آیا ہے یا نہیں؟

ریاست نے بتایا کہ وہ ابھی تک شہر ہی میں ہے۔ یہ بات اُسے اور بھی مشکوک کرتی تھی۔ بہر حال صرف اتنی بات پر اُسے مجرم نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا۔ میں نے ریاست سے پوچھا۔

”تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ واردات اُسی نے کی ہے؟“

ریاست نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن پھر اُس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اتنے میں اُس کے ساتھ آیا ہوا ایک بوڑھا شخص بولا۔

”میں اس کا چچا ہوں تھا نیدار صاحب، میں آپ کو بتاتا ہوں۔ مراد اچھے چال چلن کا لڑکا نہیں۔ اب تک ہم صرف اپنی عزت کی وجہ سے خاموش تھے۔ اُس کے گھر والے ہم سے بیٹی کا رشتہ مانگتے تھے۔ لیکن ہم نے انکار کر دیا۔ وہ لڑکا اب بھی اس پگڑ میں ہے اور دھکیاں دیتا رہتا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ فصل کو آگ بھی اسی نے لگائی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو ریاست اپنی بہن کی ڈولی نہ اٹھا سکے۔ ریاست اس گمائی پر بہن کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے مراد اور اس کے ساتھیوں نے اس کی فصل جلا دی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ریاست نے اب بھی فیصلہ نہیں بدلا اور وہ جلدی بہن کے ہاتھ پیلے کر دے گا تو اس نے چوری کی اور چیز کا سامان لے اُڑا۔ یہ تو شک ہے اُسے موقع نہیں ملا، ورنہ وہ ہماری عزت سے بھی کھیں جاتا۔ ہم اتفاق رائے سے بیان دیتے ہیں کہ فصل کے نقصان اور چوری کا ذمہ دار مراد ہے۔“

مراد کے خلاف پرچہ درج کرنے کے بعد میں نے اے ایس آئی گوبندر کو ایک چھاپہ مار پارٹی دے کر شہر روانہ کیا۔ اس پارٹی نے مراد کے چھوٹے بھائی کو بھی

ساتھ لے لیا تھا۔ دو دن کی بھاگ دوڑ کے بعد انہوں نے اُسے امرتسر کے ایک چھوٹے سے ہوٹل سے گرفتار کر لیا۔ میں اس وقت دفتر سے اُٹھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب گوبندر اُسے لئے ہوتے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ مراد نے سفید قمیص اور نمند بہن دکھائی۔ وہ مضبوط جسم کا ایک دراز قد نوجوان تھا۔ لمبوترے چہرے پر باریک مونچیں بچ رہی تھیں۔ اُس کے چہرے میں سب سے نمایاں چیز اُس کی آنکھیں تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی سو کر اُٹھا ہے۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے شک گزر کہ شاید اُس نے نشہ وغیرہ کیا ہوا ہے۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ وہ سامنے کبھی ہوتی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اب مجھے یاد پڑا تھا کہ ایک دو دفعہ پہلے بھی میں نے اُسے قصبے میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ بچکتے ہوئے قد کی وجہ سے وہ فوراً لگا ہوں میں آجاتا تھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ میں نے خالص تھانیداری لہجے میں کہا۔

”مراد علی جناب!“ وہ گھبرایا ہوا تھا لیکن بہت زیادہ نہیں۔

”کیا کرتے ہو؟“

”تھوڑی سی زمین ہے جس پر محنت کرتا ہوں“ جسم کے برعکس اس کی آواز کافی بھاری بھر کم تھی۔

”کل رات کہاں تھے تم؟“ میں نے اچانک سوال کیا۔

اُس نے بڑے اعتماد سے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور کاغذوں کا ایک پلندہ سامنے میز پر رکھ دیا۔ میں نے گھور کر دیکھا اور کاغذوں کو اُلٹنے پلٹنے لگا۔

ان کاغذوں کے مطالعے سے مراد کی پوزیشن کافی حد تک صاف ہو جاتی تھی۔ سسرٹ کو رٹ میں زمین کا ایک کس چل رہا تھا جس میں مراد علی فریق تھا۔ پشی

کی تاریخیں بدلنے کی وجہ سے اُسے گاؤں واپس آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ دوسرا بات جو مراد کے حق میں جاتی تھی وہ یہ تھی کہ ریاست کے مکان کے پچھواڑے یا زمین پر جو لیکر دیکھی تھی وہ کسی پیشہ درچور کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ یہ لیکر کسی یا بلبی لکڑی کی وجہ سے آئی تھی۔ اُن دنوں چور یہ طریقہ بکثرت استعمال کرتے تھے آج کل بھی دیہی علاقوں میں بعض چور اسی طرح چھتیں اور دیواریں پھلانگتے ہیں۔ چھ والا شخص دُور سے بھاگتا ہوا آتا ہے اور ایک بانس ناکلڑی زمین پر ٹیک کر چھ پر چڑھ جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ کام کسی عام آدمی کے بس کا نہیں تھا اور اب کوئی شہادت نہیں ملتی تھی جس سے پتہ چلتا ہو کہ مراد اس سے پہلے بھی چور یاں کر رہا ہے۔ بہر حال تعینش کے مرحلے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ نے پوچھ گچھ کے لئے مراد کو حراست میں لے لیا۔

قصبے کے ایک دو معزز افراد کی سفارشیں اُس کے ساتھ تھیں اس لئے یہ اُس پر سختی کرنے سے بچکا رہا تھا۔ میں لگتا تھا کہ سیدھی انگلیوں سے یہ لکھی نہیں نکلا۔ پہلے ایک دو گھنٹے تو وہ خوب عفا فی پیش کرتا رہا۔ اُس نے یہ بات بالکل تسلیم نہ کی کہ شادو سے اُس کا کوئی تعلق ہے۔ فصل کو آگ لگانے اور چوری کے جرم سے بھی وہ انکار ہی تھا۔ جب میں نے سخت لہجے میں بات کی تو اُس نے چپ سا دھا میں ابھی اُس کی چپ ٹوٹنے کے بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ چوہدری قاسم ریاست کے ساتھ تھانے میں داخل ہوا۔ چوہدری قاسم سے میرا تعارف پچھلے ہی دن ہوا تھا۔ وہ اُن کا کوئی رشتہ دار تھا۔ جب ریاست کی فصل کو آگ لگی تھی چوہدری قاسم اُس کے ساتھ تھانے آیا تھا۔ وہ نزدیکی گاؤں ”مہندی پور“ کا چوہدری

در کافی اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ اُس نے قریب پہنچ کر گرجشتی سے مصافحہ کیا اور کُرسی ٹھیک کر بیٹھ گیا۔ اُس کے گول سرخ چہرے پر دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ میرے بلانے سے پہلے ہی اُس نے ایک سپاہی کو آواز دی اور کہا کہ لسی کا بند و بست کرے۔ میری ابتک اس سے دو تین ملاقاتیں ہی ہوئی تھیں لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ وہ خاصا خوش خوراک شخص ہے۔ میرا تجربہ بال شاہ کافی نونہل شخص ہے لیکن اُس جیسے تین نہیں تو ڈھائی آدمی اُس کے اندر سے فروز نکلتے تھے۔ عمر کوئی پینتالیس سال کے گگ بھگ رہی ہوگی۔ لیکن صحت کافی اچھی تھی۔ میں نے پہلی ملاقاتوں میں اندازہ لگایا تھا کہ پولیس والوں سے دوستی کا اُسے جنون کی حد تک شوق تھا۔ یوں بھی وہ ایک بانجھ شخص تھا۔ اور علالت کے حالات پر اُس کی گہری نظر تھی۔ ایسے لوگوں سے رابطہ پولیس افسروں کے لئے بڑا سودمند ثابت ہوتا ہے چوہدری قاسم کی ریاست سے گہری دوستی تھی۔ اس شکل وقت میں بھی وہی سب سے زیادہ اُس کا ساتھ دے رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت بھی وہ ریاست کے لئے کوئی خوشخبری لے کر آیا ہوگا۔ لسی پینے کے بعد اُس نے بے تکلفی سے ایک طویل کاڑ لی اور بولا۔

”دخان صاحب آپ کے مجرم کا کھڑا دیا لیا ہے میں نے۔ ذرا نہر کے پل تک چلنا ہوگا آپ کو۔“

کام کی بات تھی میں فوراً چلنے کو تیار ہو گیا۔ باہر چوہدری قاسم کا سجا سجا یا ناگہ کھڑا تھا۔ ہمارے بیٹھے ہی کوچوان نے چابک لگایا۔ نہر کی پٹری پر چلتے ہوئے ہم کوئی آدھ ٹھیکے میں پل پر پہنچے۔ نانگے کے رکتے ہی قاسم کا ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا اور اس سے

باتیں کرنے لگا۔ قاسم نے تھوڑی دُور نشیب میں جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔ شام ہو چکی تھی اور خانہ بدوش کھانا پکا رہے تھے۔ جھونپڑوں کے پاس اونٹ اور جھیریں وغیرہ بندھی نظر آ رہی تھیں۔ ہم چلتے ہوئے جھونپڑیوں کے پاس پہنچے۔ بستی کے مکیں خوف زدہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے لیکن کسی کو کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ چوہدری قاسم کا آدمی ایک جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر روک گیا۔ ایک عمر رسیدہ عورت جھونپڑی سے برآمد ہوئی۔

”تمہاری لڑکی کہاں ہے مائی؟“ چوہدری قاسم کے آدمی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ اتنے میں جھونپڑی کا پردہ ہلا اور ایک سانفے رنگ کی لیکن دلکش نقوش والی لڑکی برآمد ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں گھبراہٹ نظر آ رہی تھی۔ چوہدری قاسم نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے لڑکی اور اس کی ماں کو ایک طرف کھڑا ہونے کا حکم دیا اور اے ایس آئی گویندر کو کہا کہ وہ جھونپڑی کی تلاشی لے۔ گویندر چند سیپاہیوں کے ساتھ جھونپڑی میں گھس گیا۔ لڑکی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اُس کی ماں بھی بُری طرح کانپ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد گویندر ایک چھوٹی سی گھڑی اٹھاتے برآمد ہوا۔ گھڑی میں کچھ قیمتی کپڑے بندھے ہوئے تھے۔ ریاست نے فوراً پہچان لیا۔ یہ کپڑے اُس کی بہن کے سامان میں سے تھے۔ اپنے خون پسینے کی کمائی کون بھول سکتا ہے۔ ہم مسروقہ سامان کے ساتھ لڑکی اور اس کی ماں کو تھانے لے آئے۔ لڑکی خاص طور پر مجھ سے بہت خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ میں نے سختی سے پوچھا تو اُس نے سب کچھ اگل دیا۔ اُس نے اعتراف کیا کہ مُراد سے اُس کی جان پہچان ہے۔ وہ اکثر چوری چھپے اُس سے ملتی تھی۔ اُس نے مُراد کے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتایا۔ اُس نے کہا کہ مُراد کا

نئی اور عورتوں سے بھی یارا نہ ہے لیکن وہ اُن کے نام نہیں جانتی۔ اُس نے بتایا کہ یہ کپڑے مُراد ہی نے اُسے تحفے میں دیئے تھے۔ مُراد کو اُس کے سامنے لایا گیا تو اُس نے لڑکی کو پہچاننے سے صاف انکار کر دیا۔ بہر حال ایک اہم ثبوت ہاتھ آچکا تھا اور جتنی رفت یقینی تھی۔ مُراد کو گرفتار ہونے چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے عدالت سے اس کا ریمانڈ لے لیا اور پوچھ گچھ شروع کر دی۔ لڑکی سے ہمیں بہت قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ یوں بھی اُس کا قصور قابلِ دست اندازی پولیس نہیں تھا۔ میں نے ایک دو شخصی ہمتیں حاصل کرنے کے بعد اُسے چھوڑ دیا۔

مُراد سے چونکہ مسروقہ مال برآمد کرنا تھا اس لئے سختی ضروری تھی۔ لیکن وہ بہت ہیٹ لڑکا ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے بہت کم نوجوانوں کو اتنا سخت جان پایا تھا۔ اُس نے دو دن اُس پر تھوڑا ڈگری استعمال کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ چنچنا چلا نا تو اُسے آتا ہی نہیں تھا۔ خاموشی سے مار کھاتے کھاتے یہوش ہو جاتا تھا۔ ہوش میں آتا تو سوئی سوئی آنکھوں سے غلے کے افراد کو دیکھنے لگتا تھا۔ پہلے پہلے تو مجھے اُس کے دیکھنے کے انداز پر سخت غصہ آتا تھا لیکن اب میں سمجھ گیا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا۔ چند دن بعد اُس کا ریمانڈ ختم ہو گیا۔ میں نے چالان مکمل کر کے عدالت میں پیش کر دیا۔ لیکن شہادتیں کمزور تھیں۔ وہ کوئی ایک ماہ بعد ضمانت پر رہا ہو کر واپس آ گیا۔

ابھی اُسے جیل سے آئے ہوئے چند روز ہی گزرے تھے کہ قتل کا ایک واقعہ پیش آیا۔ دوپہر سے کچھ پہلے چند دیہاتیوں نے تھانے آکر اطلاع دی کہ نہر کے پُل کے پاس پارے کے کھیتوں میں کسی عورت کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ میں اور اے آئی ایس جی چند سیپاہیوں کے ساتھ موقع وار دات رہنے۔ کھیت کے ارد گرد بہت سے

لوگ جمع تھے لیکن کسی کو اندر جانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ احتیاط سے چلتے ہوئے جب ہم لاش والی جگہ پر پہنچے تو وہاں کوئی عورت اوندرھے منہ زمین پر پڑی تھی۔ اُس کے جسم پر ایک سفید رنگ کا کھیس پڑا تھا اور سنہری بالوں کی گندھی ہوتی طویل چوٹی سانپ کی طرح کمر پر رکھی ہوئی تھی۔ اس چوٹی کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے پہلے بھی اس عورت کو کہیں دیکھا ہے۔ یہ بھی یاد پڑا تھا کہ چند روز پہلے ہی ملاقات ہوئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا لاش کے قریب پہنچا۔ اُس کا چہرہ آدھ کھلے بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کھیس کے نیچے لاش بالکل برہنہ ہے۔ میں نے بڑی احتیاط سے اُسے سیدھا کیا۔ میرے سامنے وہی خانہ بدوش لڑکی پڑی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا اُس کی گردن پر اُنکلیوں کے گھرے نشان نظر آرہے تھے۔ اُسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اُس کی کلائیوں میں کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے دھنسنے ہوئے تھے۔ سفید کھیس کے اوپر جبکہ خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ چہرے اور شانوں پر اُبھرے ہوئے نیلے نشان چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ ہلاک کرنے سے پہلے لڑکی کو درندگی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اُس کے رخساروں پر طمانچوں کے نشان بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ایک ہونٹ پھٹا ہوا تھا۔ اور ٹھوڑی کے قریب خون جم گیا تھا۔ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لاش کو اے ایس آئی محمد علی کے حوالے کر کے میں سیدھا قصبے کی طرف روانہ ہوا۔ حالات جس شخص کو مشکوک ٹھہرا رہے تھے وہ مُرا تھا۔ وہ پرسوں ہی جیل سے رہا ہوا تھا۔ خانہ بدوش لڑکی رتی سے نہ صرف یہ کہ مسرور تھا۔ سامان برآمد ہوا تھا بلکہ اُس نے مُرا کے خلاف تفصیلی بیان بھی دیا تھا۔ ظاہر ہے مُرا کہ اس بات کا رنج ہوگا۔

میں بڑی تیزی سے گھوڑا بھگاتا ہوا قصبے میں داخل ہوا۔ بلال شاہ کے علاوہ گوبندر بھی میرے ساتھ تھا۔ مُرا کے مکان کے سامنے پہنچ کر میں گھوڑے سے نیچے اُترا۔ گوبندر نے بندوق سیدھی کر لی تھی لیکن بندوق استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ میرے خدشے کے عین مطابق مُرا ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہو چکا تھا۔ گھر میں اُس کی والدہ اور چھوٹے بہن بھائی تھے۔ میں نے بوڑھیا سے پوچھ گچھ کی لیکن وہ بار بار یہی کہتی رہی۔ میرے بیٹے کو معاف کر دو وہ بے تصور ہے، اُس نے کچھ نہیں کیا۔ ماؤں کی نظر میں بیٹے کو اور قاتل بن کر بھی بے تصور ہی رہتے ہیں۔ لیکن اُن کے کہنے پر انہیں معاف نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے خفے پہنچ کر فوراً مُرا کی تلاش میں چھاپہ مار پادریوں کو روانہ کیا۔ ضروری کارروائی کے بعد خانہ بدوش لڑکی رتی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے امرتسر روانہ کر دیا گیا۔ اس کے قبیلے والے بڑے پتھرے ہوئے تھے وہ انتقام انتقام کے نعرے لگا رہے تھے۔ اُن کے مردوں کی تعداد کسی طرح بھی ڈیڑھ سو سے کم نہیں تھی۔ وہ سب کے سب پھریوں کلہاڑیوں سے لیس اور بڑی جنگجو طبیعت کے مالک تھے۔ شام کے وقت میرے مجرّوں نے اطلاع دی کہ بہت ممکن ہے رات کو یہ لوگ مُرا کے مکان پر حملہ کر دیں۔ اس خبر نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میں نے مجرّ کو مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے واپس بھیج دیا۔ خفے میں نفری بہت کم تھی۔ آدھے سے زیادہ عملے کو میں مُرا کی تلاش میں روانہ کر چکا تھا۔ دوپہر سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ٹیک نالے میں سیلاب آگیا تھا اور لم پورے کا خفانہ دوسرے تھاؤں سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس صورت میں اگر خانہ بدوش گاؤں پر حملہ کر دیتے تو انہیں روکنا بے حد دشوار ثابت ہوتا۔ حفاظتی اقدام کے طور پر میں نے مُرا کے گھر میں چند سپاہیوں کا پہرہ بٹھادیا۔ اندھیرا پھیلنے تک پورے گاؤں میں

یہ افواہ پھیل گئی کہ آج رات خانہ بدوش گاؤں پر حملہ کر دیں گے۔ پورے گاؤں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ تھانے میں اس وقت صرف ایک رائفیل اور ایک پستول تھا۔ پورے گاؤں میں ایک بھی پتی رائفیل نہیں تھی۔ دیسی ساخت کی صرف ایک بندوق نمبر دار کے پاس تھی۔ گاؤں کے چند نوجوان برچھیوں اور لاطھیوں سے مسلح ہو کر آگے تھے۔ لیکن خانہ بدوش کے مقابلے میں اس مختصر سے جھٹکے کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ پورا گاؤں مُراد کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ وہ لڑکی کو قتل کرنے کے بعد خود تو فرار ہو گیا تھا۔ لیکن اپنے گھروالوں سمیت پورے گاؤں کو مصیبت میں ڈال گیا تھا۔ مُراد کا گھر گاؤں کی بیرونی حدود میں واقع تھا۔ یہاں سے نہراپل کوئی ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ درمیان میں کھیتوں کا ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر مگرے بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ میں نے اے ایس آئی کو بندر کو بندوق دے کر مُراد کے مکان کی چھت پر بٹھا رکھا تھا۔ دو اور سپاہی بھی اُس کے ساتھ تھے وہ پل کی طرف گہری نظر رکھتے ہوئے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ خانہ بدوش چکر کاٹ کر پیچھے سے گاؤں کی دوسری جانب سے حملہ کر دیں۔ دس نوجوانوں اور دو سپاہیوں کی ٹولی کو اُس جانب کی نگرانی پر رکھا گیا تھا۔ نمبر دار اپنی دیسی ساخت کی بندوق کے ہمراہ اُن کے ساتھ تھا۔ اپنے طور پر ہم نے انتظامات کئے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ اگر خانہ بدوشوں نے حملہ کیا تو لوگوں کے جان و مال کی حفاظت مشکل ہو جائے گی۔ میں اپنے پستول سے صرف دس فائر کر سکتا تھا۔ اتنی ہی گولیاں گو بندر کے پاس تھیں۔ باقی رہی دیسی بندوق تو وہ کبھی چلتی تھی کبھی نہیں چلتی تھی۔ چاروں طرف گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ بارش گرنے کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

میں دُعا مانگ رہا تھا خدا کرے یہ رات خبریت سے گزر جائے۔ رات کوئی دس بجے گاؤں کی شمالی جانب سے شور بلند ہوا۔ لوگوں کے بولنے اور بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آئیں کوئی دس منٹ بعد چوہدری قاسم اپنے بھائی بھرکم جھم کے ساتھ دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اُس کا گول مُرخ چہرہ جُوش سے تمارہا تھا۔ ”میں آگیا ہوں خان صاحب“ ایسی کی نیسی ان پٹری واسوں (خانہ بدوشوں) کی وہ کندھے سے لٹکی ہوئی بارہ لور کی رائفیل تھپتھپا کر بولا۔ کمر سے اُس نے گولیوں کی پیٹی اڑس رکھی تھی۔ اُس کے ساتھ کوئی تیس آدمی اور تھے۔ یہ سب کھلاڑیوں اور بھیلوں سے مسلح تھے۔ چار پانچ کے پاس رائفلیں بھی تھیں۔ دراصل یہ ریاست کا کا نام نہ تھا۔ وہی مجھ سے اجازت لے کر شام کے وقت مندی پور گیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ چوہدری قاسم یاروں کا یار ہے۔ وہ اُس کی مدد کو ضرور آئے گا۔ تمام افراد کے کپڑے بیگے ہوئے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تیر کر گاؤں پہنچے ہیں۔ دو افراد کے سر پر پٹیاں بھی باندھی ہوئی تھیں۔ پتہ چلا کہ جس وقت یہ لوگ گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے۔ کسی مکان سے اُن پر پشت باری ہونے لگی۔ میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ بلال شاہ کا کا نام ہے جس حکمہ یہ افراد زخمی ہوئے تھے۔ وہاں بلال شاہ ہی ”تعینات“ تھا۔ اندھیرے میں اُس نے بغیر پہچانے ان پر انٹیں برسانی شروع کر دی تھیں۔ انٹیں پھینکے کا کوئی موقع اُس نے آج تک ہاتھ سے نہیں گنوا تھا۔ چوہدری قاسم کے پیچھے کی خبر فوراً سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگوں کو کسی حد تک اطمینان ہوا۔ صرف ایک شخص ایسا تھا جو چوہدری قاسم کی آمد پر سخت جھلایا ہوا تھا اور وہ تھا پریم سنگھ۔

پریم سنگھ کی راست سے دشمنی تھی اور چوہدری قاسم راست کر بار، کا دم بھرتا

تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پریم سنگھ مسلسل چوہدری قاسم کو گھوڑا ہاتھا۔ میں نے دیکھا وہ ایک کونے میں بیٹھا کر بان ہاتھ میں گھڑا ہاتھا اس کی سرخ سرخ آنکھیں بڑی دیر سے چوہدری قاسم پر جمی ہوئی تھی۔ رٹنے والے کو کسی بہانے کی ضرورت ہی ہوتی ہے۔ چوہدری قاسم کے ایک آدمی نے مجھے کاٹھواں پریم سنگھ کی طرف چھوڑ دیا۔ پریم سنگھ تن کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے ایک زناٹے کا تھپڑ اُس آدمی کے منہ پر چڑا اور حقہ پیکر کر صحن میں پھینک دیا۔ چوہدری قاسم نے پہلے توجہ رنجی سے میری طرف دیکھا۔ پھر اُس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔ وہ پریم سنگھ کے پاس پہنچا۔ جونہی اُس نے تھپڑ رسید کرنے کے لئے اپنا ہاتھ لٹکایا۔ میں نے پک کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ تین چار سپاہی فوراً اندر آ گئے اور انہوں نے مشتعل افراد کو پیچھے پیچھے ہٹا دیا۔ اتنے میں چھت سے گوندہ کی آواز آئی۔ وہ مجھے فوراً چھت پر آنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اُس کی آواز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے کوئی خطرہ نظر آیا ہے۔ میں نے تیز نظروں سے پریم سنگھ اور چوہدری قاسم کی طرف دیکھا۔ وہ میری نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے پیچھے پیچھے ہٹ گئے۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر پہنچا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ بارش کچھ ہلکی ہو گئی تھی۔ اسے ایس آئی گو بندر بڑے غور سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دور اُننگی سے اشارہ کرتے ہوئے مجھے کہا کہ کافی دیر سے دو تین روشنیاں نہر کے پل کے پاس نظر آ رہی ہیں۔ میں نے بھی غور سے دیکھا۔ روشنیاں واقعی نظر آرہی تھیں۔ لیکن وہ ایک جگہ ٹھہری ہوئی تھیں۔ میں تھوڑا سا آگے بڑھ کر چھت کی منڈھیر پر پہنچا۔ اچانک مجھے دیوار کے بالکل نزدیک آہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے جھک کر نیچے دیکھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ دُور تک کئی افراد چپکے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں پیچھے ہٹتا رہی کی طرح کی کوئی چیز میری گردن سے پٹ گئی۔ عین اُس وقت میں نے

گو بندر کی چیخ شنہی۔ کسی نے عقب سے اُسے دبوچ لیا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن کندھ پھینکنے والے نے مجھے گلے میں چھلانگ لگانے پر مجبور کر دیا۔ گردن میں آٹھنے والی شدید ٹیس نے میرے جسم میں انگارے بھر دیئے تھے۔ میرے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ نکلی اور میں نے سامنے آنے والے شخص کو لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ دو افراد کلہاڑیاں لہراتے ہوئے میری طرف پلکے۔ خوش قسمتی سے میرا پستول ہوسٹر سے نکلا نہیں تھا۔ میں نے پستول نکالا، ایک حملہ آور کا دار نیچے جھک کر بچایا اور دیوار کے ساتھ پشت لگا کر تین فائر کئے۔ گولیاں حملہ آوروں کی ٹانگوں پر لگیں اور وہ زمین پر گر گئے۔ اتنے میں مکان کے اندر سے چوہدری قاسم اور دوسرے مسلح افراد باہر نکل آئے۔ چھت کے اوپر سے بھی سپاہیوں نے گلی میں چھلانگیں لگادیں۔ برہمچاں لہرائیں لاٹھیوں کے ٹکمرانے کی آوازیں آئیں۔ تین چار کراہیں سنائی دیں۔ ایک آدھ فائر بھی ہوا۔ اتنے میں گاؤں کی شمالی جانب پہرہ دہنے والے افراد بھی لاٹھیاں لہراتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ لیکن اُن کے پہنچتے پہنچتے کھیل ختم ہو چکا تھا۔ خانہ بدوش اچانک اور شدید مزاحمت سے گھبرا کر جھاگ نکلے تھے۔ میری گولیاں کھا کر گرنے والے تین افراد کچھ زمین پر پڑے لوٹ رہے تھے۔ تھوڑی دور چار اور افراد زمین پر گرے پڑے تھے۔ کوئی دس خانہ بدوشوں کو گاؤں والوں نے پھڑپھڑاتا تھا۔ مخبر کی بروقت اطلاع نے نہ صرف مراد کے گھر بلکہ شاید کئی اور گھروں کو بھی پامال ہونے سے بچالیا تھا۔ جوبالی جلد اتنا زوردار تھا کہ خانہ بدوش ایک لمحے کے لئے بھی جم کر نہ لڑ سکے۔ اُن کے چھ افراد زخمی ہوئے تھے لیکن خوش قسمتی سے کوئی جان ضائع نہیں ہوئی تھی۔ گرفتار ہونے والوں میں دو عورتیں بھی شامل تھیں۔ ایک عورت تو وہی تھی جس نے کندو والے کو مجھے چھت سے گلی میں گرایا تھا۔ میں نے بھی آخر تک اُس کا گریبان نہیں

چھوڑا تھا۔ جب خانہ بدوش بھاگنے لگے تو اُس نے پوری قوت سے میرے ہاتھ پر کاٹ کھایا لیکن میں ٹپ سے مس نہ ہوا۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ وہ قتل ہونے والی رتی کی چھوٹی بہن ہے۔ وہ بھی بہن کی طرح خوبصورت رہی ہوگی۔ لیکن میں نے بے ضرری میں اُسے جو زور دار گھونسنے مارے تھے۔ اُنہوں نے اس کا مُنہ پھلا کر کپا کر دیا تھا۔ بعد میں مجھے اس پر ترس بھی آیا۔ دونوں عورتوں کو اگلے دن رہا کر دیا گیا۔ خانہ بدوشوں کے سردار سے بات چیت کے بعد میں نے باقی افراد کو بھی چھوڑ دیا۔ صرف تین یاچار آدمیوں پر مقدمہ چلا اور انہیں مزا ہوتی۔

اس لڑائی میں گاؤں کے جو دو افراد زخمی ہوئے اُن میں سے ایک ریاست بھی تھا۔ اُس کی ران میں بڑھی کا گہرا زخم آیا تھا۔ برسات کے دن تھے۔ چند روز میں اُس کا زخم بہت خراب ہو گیا۔ اور اُسے امرتسر ہسپتال لے جانا پڑا۔ دن گزرتے رہے۔ مراد کو اشتہاری مجرم قرار دے دیا گیا تھا۔ میں رات دن اُسے گرفتار کرنے کی کوشش میں تھا۔ لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ایک دن اسی کیس کے سلسلے میں امرتسر گیا تو ریاست کی عیادت کے لئے ہسپتال بھی پہنچا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اور زخم میں پیپ بھر گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ رونے لگا۔ بیماری نے اُس کی رہی سہی ہمت بھی توڑ دی تھی۔ اُس نے بتایا کہ گھر کی حالت بہت پتلی ہے۔ اگر چوہدری قاسم اُس کے گھر کی خبر گیری نہ کرتا تو اُس کی ماں اور بہن بد رہ رہ جاتیں۔ اُس کی بہن شادو بھی اس کے پاس ہی بیٹھی ہوتی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ بڑی افسردہ نظر آ رہی تھی۔ ذاتی بھاگاں نے بتایا تھا کہ مراد اب اُس کے دل سے اُتر گیا ہے۔ وہ اُس سے نفرت کرنے لگی ہے، لیکن مجھے پتہ تھا کہ لڑکوں کے بارے میں لقمہ سے کچھ ہنسنے کا حاسنہ عورت کب محنت کرتی ہے اور

سب نفرت یہ صرف وہی جانتی ہے اور کوئی نہیں جان سکتا۔ اچانک میں اپنے نیالوں سے چونک اُٹھا۔ چوہدری قاسم ایک ٹوکر کے ساتھ پھلوں کا ٹوکرا لاتے ہوئے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اُس نے ٹوکرا زمین پر رکھ دیا۔ پھر اُس کی نظر پہلی بار شادو پر پڑی۔ اُس کی نظر کا انداز دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اُس کی آنکھوں نے ایک ہی لمحے میں مجھے حرم ہوس کی ایک طویل داستان سُنادی تھی۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ چوہدری قاسم ریاست کی بہن کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اپنے خیال پر خود بھی حیرت ہوتی۔ چوہدری قاسم کی عمر کسی طرح پتائیس چھیالیس سے کم نہیں تھی۔ میں جو اُسے کا فیصلہ کر رہا تھا چوہدری قاسم کی آمد پر پھر حرم کر بیٹھ گیا۔ چوہدری بڑا بھلا ہوتا تھا۔ مونچھوں کو بار بار بل دے رہا تھا اور ذرا ذرا سی بات پر اُس کے دل سے ہنسی اُبلنے لگتی تھی۔ ہنستے ہوئے اُس کی بھاری بھر کم تو نذر زور سے ہلتی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ بھی اُس کے ساتھ قہقہے لگا رہی ہے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں سُرُخ دوڑے اُس کی رنگین مزاجی کی داستان سُنا رہے تھے۔ گفتگو کے دوران گاہے گاہے درزیدہ نگاہوں سے شادو کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ شادو کی پلکیں جھبکی لیتی تھیں اور وہ بے خیالی میں ہولے ہولے بھائی کا بازو دبا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ چوہدری کی پُرسوسنگاہوں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کر رہی ہے چوہدری قاسم کی زندگی کا یہ پہلو اس سے پہلے میری نظروں سے بالکل اوجھل تھا۔ اب جبکہ یہ میرے سامنے آیا تھا۔ میرا ذہن کسی اور ہی انداز سے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے ریاست کو پیش آنے والے واقعات کے سلسلے میں صرف دو مشکوک ام میرے ذہن میں تھے۔ ایک مراد اور دوسرا پریم سنگھ، لیکن اب ان میں ایک تیسرا

نام شامل ہو گیا تھا، چوہدری قاسم کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ سارا کھیل چوہدری قاسم کا کھیل ہوتا ہو۔ وہ شاد کو چاہتا ہو۔۔۔ اس کے لئے اُس نے ایک منصوبہ بنایا ہو اور اب۔۔۔۔۔ اب اُس کی بہن سے شادی رچانا چاہتا ہو۔۔۔ اور پھر دفعتاً میرے ذہن میں ایک ایسی بات آئی کہ میں خود بخود کسی سے کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں موجود افراد حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔

”اچھا میں جانتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے“ میں نے اپنی ٹوپی سنبھالتے ہوئے کہا۔ میں جلد از جلد تنہائی میں پہنچ کر کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ باہر کو چوان تانگے میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں کھلی نشست پر بیٹھ گیا اور اس کمائی کا تانا بانا بننے لگا۔ مجھے کوئی ایک ماہ پہلے کی ایک بات یاد آئی تھی۔ رام پورہ میں مجھ سے پہلے جو انسپکٹر فرائض انجام دیتا تھا وہ آج کل جالندھر کے ایک نوای تھا نے میں تھا۔ اُس سے میری ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں چوہدری قاسم کا ذکر آیا۔ اُس نے مجھے چوہدری قاسم کے اثر و رسوخ سے آگاہ کیا اور بتایا کہ بڑا کام آنے والا آدمی ہے۔ اُس نے چوہدری کی ایک دلچسپ بات سناتے ہوئے کہا کہ کچھ عرصہ پہلے شادی بیاہ کی ایک تقریب میں کسی لڑکی نے چوہدری کو ”بھائیو“ کہہ دیا۔ اس لڑکی کا نام رانی تھا اور وہ چوہدری کی کوئی دُور کی رشتہ دار تھی۔ چوہدری کو اس کی بات کا بہت غصہ تھا۔ وہ مجھ سے بہت بے تکلف تھا۔ اکثر کہا کرتا تھا کہ اگر وقت نے ساتھ دیا تو وہ اس رانی کو دل کی ”رانی“ بنا کر چھوڑے گا۔۔۔۔۔

میں جان گیا تھا کہ وہ رانی کون تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں ریاست کے پاس بیٹھا تھا۔ اُس نے شاد سے کہا تھا رانی مجھے ذرا اٹھا کر بٹھاؤ۔۔۔۔۔ شاد کو کا

سر ملو نام رانی تھا۔ ایک ایک کر کے واقعات کی تمام کڑیاں جڑتی جا رہی تھیں۔ چوہدری اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے معصوم دبے گناہ لڑکی سے انتقام لینے جا رہا تھا۔ وہ اُس سے شادی رچانا چاہتا تھا۔ اُس کے لئے اُس نے پہلے ریاست سے اُس کی خوشحالی چھینی۔ پھر ایک تیر سے دو شکار کرتے ہوئے اپنے رقیب کو راستے سے ہٹا دیا۔ اُس نے چوہدری کا الزام مراد کے سر لگوا دیا۔ اُس نے خانہ بدوش رتی سے مل کر ایک چال چلی۔ اس چال نے نہ صرف مراد کو چور بٹھرایا بلکہ اُسے شاد کی نظروں سے بھی گرا دیا۔ بعد ازاں کسی وجہ سے جھوٹی گواہی دینے والی رتی کے ساتھ چوہدری کی ان بن ہو گئی۔ ہو سکتا ہے رتی نے دھمکی دی ہو کہ وہ ساری بات پولیس کو بتا دے گی۔ چوہدری نے اُسے پولیس تک پہنچنے سے پہلے ہی درندگی کا نشانہ بن کے قتل کر ڈالا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر دُور فائدہ حاصل کیا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی کے قتل کا الزام مراد کے سر آئے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ مراد خود کو پولیس کی گرفتاری سے بچانے کے لئے روپوش ہو گیا۔ شاد کو جیننے کے لئے اب میدان صاف تھا۔ جب خانہ بدوشوں نے حملہ کیا تو چوہدری بڑی جرأتور کا ثبوت دیتے ہوئے گاؤں والوں کی مدد کو آ گیا۔ محالات نے اُسے اپنا منصوبہ آگے بڑھانے کا ایک اور موقع تھا۔ ریاست زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ گیا۔ چوہدری نے اُس کے گھر کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ اُس نے ریاست کی ہمدردیاں جیتنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنوا یا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ اگلے چند دنوں میں میرے لگاتے ہوئے تقریباً تمام اندازے درست ثابت ہوئے۔

میری توقع کے عین مطابق صرف دو روز بعد یہ خبر آئی کہ چوہدری قاسم ریاست

کی بہن سے شادی کر رہا ہے۔ میرے خیالات کی بہ طور تصدیق ہو گئی تھی۔ میں نے
دائی بھاگل سے ایک دفعہ پھر کام لیا۔ اُس نے اگلے روز مجھے ریاست کے گھر کی مفصل
رپورٹ ہم پہنچادی۔ اُس نے بتایا کہ چوہدری قاسم نے ریاست کو قرضے کے بوجھ سے
اتنا دبا لیا ہے کہ وہ انکار کر ہی نہیں سکتا۔ اُس کی ماں اس بے جوڑ رشتے پر بالکل تیار
نہیں۔ لیکن بیٹے کے سامنے اُس کا کوئی بس نہیں چلتا اور اب تو شاد بھی اس شادی پر
رضامند ہو گئی ہے۔ اُس نے اپنے بھائی کی مرضی کے سامنے مڑ بھکا دیا ہے۔ میرے
ذہن میں ایک لمحے کے لئے شادو کا خیال آیا اور پھر چوہدری قاسم کے قبضے لگائی ہوئی
توندنگاہوں میں گھوم گئی۔ یہ سراسر زیادتی تھی۔۔۔ ایک معصوم پھول کو سازش کی انگلیوں
سے کچلا جا رہا تھا۔ قانون کا محافظ ہونے کے ناطے میرا فرض تھا کہ اس قانونیت کو
روکنے کی کوشش کروں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یہ ظلم نہیں ہونے دوں گا۔ اُس دن
سے میں نے اپنے تمام ذرائع چوہدری قاسم کے خلاف شہادت ڈھونڈنے میں لگا دیے۔
دوسری طرف میں ریاست سے ملا اور اُسے ڈھکے چھپے لفظوں میں بتایا کہ شادی کی تاریخ
طے کرنے میں جلدی نہ کرے۔ میں کچھ تحقیقات کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے بڑا مسئلہ مراد کا تھا۔ اُس کے مفروضے ہونے کی وجہ سے حالات اُس کے
خلاف ہو گئے تھے۔ اگر وہ بے قصور تھا تو اسے فوراً تھانے حاضر ہو جانا چاہیے تھا۔
چوہدری قاسم نے اُسے اتنا نقصان نہیں پہنچایا تھا جتنا اُس کی روپوشی اُسے پہنچا رہی
تھی۔ میں چوہدری قاسم کے خلاف تحقیقات کے سلسلے میں بڑا پر امید تھا۔ لیکن تین
ہفتے کی مسلسل کوشش کے بعد مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ یا تو چوہدری قاسم ایک نہایت
ہوشیار اور گھاگ مجرم ہے۔ ایسا مجرم جو اپنے جرم کا کوئی نشان باقی نہیں چھوڑتا، یا پھر

بے قصور ہے۔ چوہدری کو اپنے خلاف ہونے والی دُر پزیر تحقیقات کا علم ہو چکا
لیکن وہ ایک بار بھی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ ماں طاق کے منظر ہرے کے لئے
نے اپنی حویلی میں ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ جس میں پولیس کے کئی افسر بھی
تھے۔ اُس نے مجھے بھی بلایا تھا لیکن میں نہیں گیا۔ ریاست ہسپتال سے فارغ ہو کر
آ گیا تھا۔ اور آتے ساتھ ہی اُس نے شادی کی تاریخ مقرر کر دی تھی۔ شادی کی
اماں زور شور سے جاری تھیں۔ ریاست کا مکان میرے پچھوڑے کی لگی میں
تھا۔ رات کو ڈھولک کی آواز اور لڑکیوں کے گیت میرے گھر کی چھت پر باسانی
جاتے تھے۔ جب بھی لڑکیوں کے گیت سنائی دیتے۔ میرے ذہن میں دو خاموش
ہن گھومنے لگتیں۔۔۔۔۔ سوئی سوئی آدھ کھلی آنکھیں میں ان آنکھوں کو پہچانتا تھا۔
ان نوجوان کی آنکھیں تھیں۔ جسے میں نے سات روزہ دیمانڈ کے دوران بے وردی سے
اتنا۔ لیکن اس کے ہونٹوں سے ایک کراہ بلند نہیں ہوتی تھی۔ ان آنکھوں میں کوئی بات
میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ اگر ریاست کی
شادی ایک عیاش اور کینہ پرور شخص سے ہو گئی تو اُس کا قصور وار میں ہوں گا،
میں میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ شخص مجرم ہے لیکن میں اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔
میں نے ایک لمحہ سے مجھے کھلے میدان میں چیلنج کر دیا تھا کہ میرے خلاف گواہی ڈھونڈ
تو ڈھونڈو تین ہفتے میں میں نے بہت ٹکیریں ماریں تھیں۔ لیکن کوئی زبان نہیں
..... کوئی ہاتھ بلند نہیں ہوا تھا۔
ادی سے ایک روز پہلے قاسم سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ رام پورے کے

سنار سے کچھ زور لینے کے لئے آیا ہوا تھا۔ سب سے پہلے تلنگے پر سوار وہ تھانے کے سامنے سے گزرا۔ کچھ آگے جا کر اُس نے ناگھر روکا اور خیرہ انداز میں چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ اُس کی تمخراہ، منہی پر میرا خون کھول اٹھا۔ وہ میرے شانے کو پھینٹھا کر بولا۔ ”بادشاہ، غصہ تھوک دو۔ آپ کے گاؤں کا جاتی ہوں، کچھ توقع نہ کرنا“

ہونی چاہیے؟

سارے کا سارا خون مجھے اپنے سر کو چڑھتا ہوا محسوس ہوا، لیکن میں نے خود پتا بڑھالیا۔ جب وہ بے بسے لگے دھبے بھرتا ہوا واپس جا رہا تھا۔ میں ایک انتہائی اہم فیصلہ کر چکا تھا۔ پوری زندگی میں میں نے صرف چند جذباتی فیصلے کئے ہیں اور یہ اُن میں سے ایک تھا۔ میں اپنی کرسی سے اٹھا اور اُسے آواز دی، وہ جاتے جاتے رُک گیا۔ میں آہستگی سے چلتا ہوا اُس کے پاس پہنچا۔ میں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک تیر جلائے جا رہا تھا۔ یہ میرا پر بھی لگ سکتا تھا اور اُس کے خطا ہونے پر میری پٹی بھی اُتر سکتی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لمبے میں کہا۔

”چوہدری۔ مراد کو کہاں چھپا رکھا ہے؟“

اُس کا چہرہ ساٹ رہا لیکن آنکھوں میں لہرانے والا ایک رنگ میری نظروں

ادھل نہ رہ سکا۔

”کیا کہتے ہو بادشاہ! طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”رتی کے قتل میں تمہارے ساتھ اور کون شریک تھا؟“ میں نے اُس کا سوا

نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

اُس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے پاگل سمجھ رہا ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ قہقہہ

اور اس کی توند ملنا شروع ہوتی۔ میرا ایک زور دار ہاتھ اُس کے منہ پر پڑا۔ اور اُس کا شہ اُتر کر دور جا کر اتانگے میں بیٹھے ہوئے مسلح افراد چمکانیں لگا کر نیچے اُترے۔ اُن کے تیور خطرناک نظر آتے تھے۔ میرے دونوں اے ایس آئی سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی آدمی بددق سیدھی کرتا وہ انہیں گھیرے میں لے چکے تھے۔ چوہدری نے تھمہ کے اندر سے پستول نکالا لیکن میرے پاؤں کی ٹھوکرنے اُسے ہوا میں اچھال دیا۔ ایک اور ٹھوک کھا کر وہ دوہرا ہو گیا۔ دو سپاہیوں نے اُسے پکڑ لیا۔ وہ مجھے سنگین نتائج کی دیکھیاں دے رہا تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔ اب میں حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھا۔

سہ پہر کے وقت چوہدری اپنے گاؤں میں ہندی پور میں اس طرح داخل ہو رہا تھا کہ اس کی پکڑی گئے میں جھول رہی تھی۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور وہ میرے گھوڑے کے پیچھے بیدل چل رہا تھا۔ ہندی پور کے لوگ گھروں سے نکل نکل کر یہ حیرت انگیز منظر دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں خوف سے پٹی ہوتی تھیں۔ اور وہ ڈری ڈری کر گشتیاں کر رہے تھے۔ انہوں نے آج تک چوہدری کو پولیس افسروں کے شانہ بشان چلتے اور ایک مترخوان

دعوتیں اڑاتے دیکھا تھا۔ وہ اُن کے نزدیک پولیس افسروں سے بڑھ کر قابل احترام اور با اختیار تھا۔ پولیس افسر تو روز بدلتے رہتے تھے۔ لیکن چوہدری برسوں سے اُن کا حاکم

سالاد رہا تھا۔ وہ اپنے حاکم کی اس حالت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

میں چوہدری کے اثر و رسوخ سے اچھی طرح واقف تھا۔ احتیاطی طور پر میں نے

دیکھا تھا کہ میں نے بھی پولیس کے کچھ سپاہی منگوائے تھے۔ جب پولیس نے چوہدری کی

دعا بالاحیولی میں داخل ہونے کی کوشش کی تو دروازے پر موجود مسلح آدمیوں نے

انت کی۔ میں نے اے ایس آئی گوندر اور محمد علی کو اشارہ کیا۔ وہ دس منہ سپاہیوں

میرے قدموں کے پاس آکر وہ گر گئی اور زور زور سے کچھ بولنے لگی۔ ایک بوڑھا شخص آگے بڑھا اور بدحواسی میں عورت کا منہ بند کرنے لگا۔ عورت بلند آواز میں رُو رہی تھی۔ میں نے بوڑھے کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ عورت کے پاس جا کر میں نے اُسے زمین سے اٹھایا۔ جذبات کی شدت سے عورت کا سارا وجود کانپ رہا تھا۔ اُس نے اپنا ہڈیوں بھرا کمزور ہاتھ بند کیا پھر اُس کی استخوانی انگلی چوہدری قاسم کی طرف سیدھی ہوئی۔ اُس نے اپنا سانس اندر کی طرف کھینچا، پھر جیسے صدیوں سے قید آواز ایک چیخ بن کر اُس کے حلق سے آزاد ہوئی۔

”یہ ظالم ہے، یہ زندہ ہے، یہ قاتل ہے.....“ تھانیدار صاحب، اُسے پھانسی پر لٹکا دو.....۔ اس نے شادی کے روز میری بہو کی عزت لوٹی اور میرے اکھوتے بیٹے کو قتل کر دیا۔“

بڑھیا کی آواز، گھٹکھٹور گھٹا سے ٹپکنے والا بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی۔ ذرا ہی دیر میں کئی اور فریادی سمنے آئے..... اور پھر لوگ اس شیطان صفت چوہدری کے خلاف نفرت انجیر نعرے بلند کرنے لگے۔ ایک شخص نے بتایا کہ چوہدری نے حویلی کے نیچے ایک بہت بڑا تہہ خانہ بنا رکھا ہے۔ یہ شخص خود پولیس کو تہہ خانے کے خفیہ دروازے تک لے گیا۔ تہہ خانے کے اندر سے چار محسوس افراد برآمد ہوئے۔ یہ چاروں افراد چوہدری کی خود ساختہ جیل میں ناگردہ گناہوں کی منرا جھگت رہتے تھے۔ ان قیدیوں میں ایک مراد بھی تھا۔ وہ ہڈیوں کا دھانچہ بن چکا تھا۔ لیکن اس کی نیم دا آنکھوں میں خوابوں کی چمک ابھی باقی تھی.....۔ خواب جو اُسے زندہ رکھے ہوئے تھے، خواب جو بار بار کہہ رہا تھا کہ.....

کے ساتھ چوہدری کے ان آنچوں پر پل پڑے۔ گاؤں کے چوک میں ان غنڈوں کی یادگار پٹائی کی گئی۔ یہاں تک کہ وہ مٹی میں لوٹنے اور چیخ و پکار کرنے لگے۔ سپاہی دند بکتے ہوئے حویلی کے اندر گھس گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس اور سول حکام میں چوہدری کی بہت دوستیاں ہیں۔ اس سے پہلے کہ اُس کی گرفتاری کی خبر پھیلتی، مجھے اس کے خلاف کوئی محسوس ثبوت ڈھونڈنا تھا۔ دوسری صورت میں میں سخت مشکل میں گرفتار ہو سکتا تھا۔ حویلی کی مکمل تلاشی لی گئی۔ لیکن شراب کی چند بوتلوں اور ایک دو بند وقوں کے سوا کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہ ہو سکی۔ ایک لمحے کے لئے میرے ماتھے پر پینینہ آگیا۔ میں ایک بہت بڑا قدم اٹھا چکا تھا۔ یہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اب کچھ نہ کچھ برآمد ہونا ضروری تھا۔ میں ایک بار خود حویلی میں داخل ہوا۔ تلاشی لی لیکن کوئی مزید چیز برآمد نہ ہو سکی گاؤں کے چوک میں پولیس والے چوہدری کے آدمیوں کو گھیرے کھڑے تھے۔ ایک طرف گو بند چوہدری کی ہتھکڑیاں تھامے کھڑا تھا۔ چوہدری کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک بار پھر ناتواں چمک اُترنے لگی تھی۔ گاؤں کی آبادی یہاں دلوں ٹولہوں میں کھڑی چُپ چاپ تماشا دیکھ رہی تھی۔ میں چوہدری کے قریب پہنچا تو وہ چیخ کر بولا۔

”کچھ نہیں ملے گا تھانیدار، کچھ نہیں ملے گا تمہیں۔ تم اپنا کام کر چکے اب میرا کام دیکھنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

”جو اس بند کرو“ میں دھاڑا۔ ”تم مجرم ہو اور بیثبات ہو کہ رہے گا۔ اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود مجھے بھی محسوس رہا تھا۔ ابھی چوہدری قاسم نے اپنا مخصوص ہتھ لگانے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ مجھے میں سے ایک بوڑھی عورت تیر کی طرح میری طرف بڑھی۔

چوہدری قاسم کو ڈکیتی قتل اور آبروریزی کے کئی مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔
اُسے مجموعی طور پر بیس سال قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ ریاست اور مُراد میں صلح ہو گئی
لیکن ایک عرصے تک مُراد کی ”مُراد“ پوری نہیں ہوئی۔ آخر کوئی ایک سال بعد ریاست
کا رویہ نرم ہوا اور اُس نے بہن کا ہاتھ مُراد کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کیا۔

الو اگائے آج

میں نے میز پر رکھی ڈاک کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک میلے رنگ کا لفافہ دیکھ کر میں
”ننگ اُٹھا۔ میں اس لفافے پر گھسیٹے ہوئے الفاظ کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔۔۔۔۔ میں نے
بلدی سے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے چھوٹی کاپی کا ایک میلا سا صفحہ برآمد ہوا۔ ٹیڑھے میڑھے
روشن میں لکھا تھا۔

”دارو کی بھٹی نالے کے پرلی طرف چلی گئی ہے۔ جامنوں والے باغ میں جمعے کے
روز ننگ گھڑے نکلنے والے ہیں۔“

حالانکہ تحریر سے مفہوم واضح نہیں ہوتا تھا۔ لیکن میں اس کا مطلب اچھی طرح سمجھتا
تا۔ بتانے والے نے بتایا تھا کہ اجیت سنگھ نے شراب کی بھٹی ایک نئی جگہ پر چاکو کر لی
ہی اور جمعے کے روز چھاپہ مارنے سے مجرم رنگے ہاتھوں پکڑے جاسکتے تھے کیونکہ اس
روز گھڑے نکال کر شراب کشید کی جانے والی تھی۔۔۔۔۔ آج جمعے کا دن تھا۔ میں نے
ٹھٹری کی طرف دیکھا شام کے چار بجنے والے تھے۔ میں نے فوراً اے ایس آئی کو بندرنگ
دبایا اور چھاپے کے لئے ہدایات دینے لگا۔

رات بہت تاریک اور سرد تھی۔ ہوا کے جھونکے دھان کے کھیتوں میں سرسراہٹ

پیدا کر رہے تھے۔ یہ سرسراہٹ ہمارے لئے بہت مفید تھی۔ میرے ساتھ لے لیر آتی گو بندر اور تین سپاہی کھیتوں کے درمیان جھک کر چلتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کے بالکل پاس پہنچ چکے تھے۔ میں نے ننھوں کو سکھوڑا۔ لاہن کی بوساف اپنا پتہ دے رہی تھی۔ ہم تھوڑی دور اسی طرح جھکے ہوئے گئے۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لے لیر آتی اور تینوں سپاہی درختوں کے ارد گرد پھیل گئے۔ میں نے پستول نکالا اور باقی سپاہیوں کو لے کر تیزی سے درختوں کے درمیان خالی جگہ کی طرف لپکا۔ وہاں کا منظر ہماری توقع کے عین مطابق تھا۔ چار آدمی ہلکے پھلکے کرنے میں مصروف تھے۔ ایک طرف ایک بھٹی میں آگ جل رہی تھی۔ اس پر ایک بڑا سا برتن رکھا تھا۔ کچھ ٹین کے ڈبے اور خالی بوتلیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔

”خبردار“ میں نے گرجدار آواز میں کہا۔ کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“

چاروں آدمیوں کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ پھر ان میں سے ایک جو درختوں کے بالکل قریب تھا اچانک بھاگ اٹھا۔ میرے پستول سے شعلہ نکلا۔ گولی اُس کی پٹٹی پر لگی لیکن وہ رکا نہیں۔ ”زمین پر لیٹ جاؤ“ میں نے ہوا میں فائر کرتے ہوئے باقی تینوں افراد کو دھمکایا۔ وہ جلدی سے لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد لے لیر آئی گو بندر اور دو سپاہی بھاگنے والے شخص کو گرفت میں لے کر درختوں سے غوردار ہوئے۔ میں اُسے فوراً پہچان گیا وہ مکھا سنگھ کا بڑا لڑکا اجیت تھا۔

یہ تیسری دفعہ تھی کہ اجیت سنگھ کی جھٹی پٹری گئی تھی۔ اس سے پہلے بھی ایسے ہی دو گنا مخطوں پر میں نے کامیاب چھاپے مارے تھے۔ اجیت کا باپ مکھا بیہاں کا کھانا پیتا زمیندار تھا ”اٹھراہ“ کے گاؤں میں اگر کوئی اس کی برابری کر سکتا تھا تو وہ اُس

کا بڑا بھائی لاکھا سنگھ تھا۔ لاکھا سنگھ اور مکھا سنگھ اور اُن کی اولاد میں بڑائیاں تو بیشمار تھیں لیکن اُن کی ایک خوبی نے سب بڑائیوں کو چھپا لیا تھا اور وہ خوبی تھی اتفاق کی۔ اُن کے اتفاق کی ارد گرد کے لوگ مثالیں دیتے تھے۔ دونوں نے ساری زندگی نہایت سلوک سے گزار دی تھی اور اب اپنی اولادوں کے زمانے میں بھی انہوں نے اس سلوک کو کم نہیں ہونے دیا تھا۔ بڑے بھائی لاکھا سنگھ کے چار بیٹے راجندر، زمیندر، سرمندر وغیرہ تھے۔ چھوٹے بھائی مکھا سنگھ کے تین بیٹے اجیت، رنجیت اور دلجیت تھے۔ مکھے کے بیٹے کافی تیز طرار تھے اور آئے دن کہیں نہ کہیں پھٹا ڈال لیتے تھے۔ بڑے بھائی لاکھے کے بیٹے بھی کچھ کم نہیں تھے لیکن مکھا سنگھ کے بیٹوں کی نسبت کچھ امن پسند تھے یہ کی انہوں نے دوسری طرح پوری کی تھی۔ وہ کینگی اور عیاری میں چچا زاد بھائیوں سے دو ہاتھ آگے تھے۔ لاکھا اور مکھا کی زمین گاؤں سے باہر کافی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بظاہر یہ لوگ زمیندار کرتے تھے لیکن مکھا کے بیٹے زمیندارے کے علاوہ غیر قانونی چکر بھی چلاتے رہتے تھے جہاں تک میں نے مشاہدہ کیا تھا لاکھا اور مکھا کے کچھ اصول تھے وہ ایک دوسرے کے عیبوں کو چھپاتے تھے۔ گھر اور باہر کے تمام فیصلے اکٹھے بیٹھ کر کرتے تھے۔ ایک دفعہ کوئی فیصلہ ہو جانے پر سب لوگ اُس پر ڈٹ جاتے تھے۔ فیصلہ چاہے غلط ہوتا تھا لیکن وہ اتنی مضبوطی سے اُس پر قائم ہو جاتے تھے کہ اُس پر صیغ کا گھان ہونے لگتا تھا۔ لگان کی ہیرا پھیری سے لے کر لڑکیوں کے اغوا تک اور لڑکیوں کے اغوا سے لے کر ناجائز نیچے ٹھکانے لگانے تک۔ ہر کام وہ کرتے تھے۔ لیکن اس طریقے سے کہ کسی کو اُنکی اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ظاہر ہے ان کے ارد گرد اُن کے مخالفین بھی ہوں گے لیکن اُن کی متفقہ طاقت سے خوف کھاتے ہوئے وہ

سب خون کے گھونٹ پئے بیٹھے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ خطوں والا سلسلہ بھی اُن کے کسی درپردہ دشمن کا چلایا ہوا تھا۔ لیکن کچھ بھی تھا یہ شخص کام ٹھیک ٹھاک کر رہا تھا۔ خط پر جو دھوڑ قصبے کی مہر ہوتی تھی۔ جو امرتسر جانے والی سڑک پر کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر تھا۔

دوسرے روز مجر بلال شاہ تھانے آیا۔ اُس نے آتے ساتھ ہی کہا۔

”خاں صاحب! آپ کی پیش گوئی ٹھیک نکلی۔ لاکھا اور ماکھا کے درمیان کچھ

اُن بن ہو ہی گئی ہے۔“

میں نے اُسے جھڑکا کہ اتنی اونچی آوازیں اطلاع دینے کی کیا ضرورت تھی بلال شاہ! تھا تو بڑے کام کا آدمی لیکن اُس میں دوا میاں تھیں۔ ایک تو افسر کے ساتھ بے تکلف ہو جاتا تھا۔ دوسرے تھانے میں آتے ہی بغیر سوچے سمجھے اونچی آوازیں بولنا شروع کر دیتا تھا۔ پچھلے ایک مہینے سے وہ لگانا یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے چھاپوں کا لاکھا اور ماکھا کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اُس کا کہنا تھا کہ میں چالیس سال سے ان لوگوں کے درمیان رہ رہا ہوں۔ ان لوگوں کے تعلقات آپس میں خراب ہو ہی نہیں سکتے۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ اُن کے تعلقات پر ان واقعات کا ضرور اثر پڑے گا۔ میرے خیال کی بنیاد یہ وجہ ہی تھی کہ یہ لوگ ہر کام انفاق راستے سے کرتے تھے۔ اگرچہ لاکھا کے لڑکے شراب کشید کرنے کے چکر میں نہیں تھے لیکن انہیں علم تو سارا ہو گا کہ شراب کی بھٹی کہاں منتقل کی جا رہی ہے۔ شراب کب نکلی گی وغیرہ وغیرہ۔ یہ لوگ ہر کام نہایت رازداری سے کرنے کے عادی تھے۔ غیر قانونی کاموں کے لئے اپنے اعتماد ترین کارندوں کو استعمال کرتے تھے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وہ ہر بار پکڑے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے

موم پھر کر دھیان لاکھا کے لڑکوں کی طرف جاتا تھا۔ پچھلے دو چھاپوں کے بعد لڑکوں میں یقیناً اُن بن ہوئی ہوگی لیکن لاکھا اور ماکھا نے معاملے کو سمیٹ لیا ہوگا لیکن سرے کامیاب پھلپے کے بعد آگ میں سے دھواں نکالنا لازمی تھا۔ لگتا تھا فرج نے بعد اب اس خاندان پر زوال کے دن آگئے تھے۔ لڑکوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ اُن اُس کی نوعیت اور شدت کا علم بلال شاہ کو نہیں تھا۔ ہر حال دوسرے دن آٹھ اس بارے میں ایک دوسرے منجر سے پتہ چل گیا۔ اُس نے بتایا کہ لاکھا سنگھ کے ایک فریئر اور ماکھا سنگھ کے لڑکے رنجیت کے سروں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ شاید اُن کا کسی سے جھگڑا ہوا ہے لیکن میں اس معاملے کو سمجھتا تھا۔ کل یقیناً وہ لوگ آپس میں لڑے تھے لیکن دونوں جہان دیدہ بوڑھوں نے عقلمندی سے اپنے اپنے لڑکوں کو ایک بار پھر صلح پر مجبور کر دیا تھا۔

چند روز بعد ایک اور پہلا نفاذ آگیا۔ اب کی بار اُس میں ایک نہایت اہم اطلاع تھی لیکن اس دفعہ اطلاع بڑے بھائی لاکھا سنگھ کے متعلق تھی۔ ماجھے کا ایک بدنام ڈاکو جو پہلے دنوں پولیس کی حراست سے فرار ہو گیا تھا لاکھا سنگھ کے گھر چھپا ہوا تھا۔ میں نے لاہور میں متعلقہ تھانے کو اطلاع دی۔ اگلے روز ہم نے پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ لاکھا سنگھ کے مکان پر چھاپہ مارا۔ یہ ایک بہت بڑا مکان تھا اور ارد گرد کے علاقے میں بی جوبلی کے نام سے مشہور تھا۔ جوبلی کے ایک حصے میں لاکھا اور دوسرے میں ماکھا رہتا تھا۔ پتا ہوا کہ لاکھا اس وقت جوبلی میں موجود نہیں تھا ورنہ خون خرابے کے بغیر مفور کا ہاتھ انا ممکن نہیں تھا۔ مفور کا نام جبرو تھا۔ اُس نے جب چاروں طرف پولیس کی گارد دیکھی۔ اختیار چھینک کر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ لاکھا سنگھ اُس وقت امرتسر میں تھا۔

اس کی بگڑی گلی میں جھول رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ صبح جب زبیر دروازہ پر تک نہیں اُٹھا تو اُس کی بھابی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ چار پانی سے نیچے گرا بیڑا تھا۔ کسی نے تیر دھار نہری سے اس کا گلا کاٹ دیا تھا۔ وہ پھر نہ دے لگا۔ میں موقع واردات پر پہنچا۔ کمرے میں جدوجہد کے آثار نہیں تھے۔ مقتول شاید تڑپنے کی وجہ سے نیچے گر گیا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر زخم کا معائنہ کیا۔ گھاؤ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ لیکن زرخرہ کٹ چکا تھا۔ اسے کی کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ صرف ایک دروازہ تھا۔ ساتھ والے کمرے سے اُوپچی اندر میں خودتوں کے بین سنائی دے رہے تھے۔ میں نے مقتول کی بھابی کو بلا کر اُس سے پند سوال کئے۔ وہ بیس بائیس سال کی ایک عام سی گھریلو عورت تھی۔ اُس نے بتایا کہ دھوپ چڑھے میں نے دیر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ وہ نون میں لت پت فرش پر پڑا تھا۔ میں نے اُس سے چند سوال اور کئے۔ پھر میں نے اسے ایس آئی گویندر کو موقع واردات کا نقشہ تیار کرنے کا حکم دیا اور بیٹھک میں آکر لایا۔ قریب دو گھنٹے میں لکھا سنگھ اس کے لڑکوں اور رات پہرہ دینے والے چوکیداروں سے حالات کترارہا۔ لکھا سنگھ اور اُس کے لڑکے کسی حد تک خاموش اور افسردہ دکھائی دیتے تھے۔ میں ماحول میں عجیب طرح کی کشیدگی محسوس کر رہا تھا۔ سب لوگ خاموش تھے۔ بس بسے اندر ہی اندر کوئی کھڑکی پاک رہی تھی۔۔۔۔۔ کچھ فیصلے ہو رہے تھے۔ آخر میں نے لکھا سنگھ سے سوال کیا کہ وہ ابتدائی رپورٹ میں کس کا نام لکھنا چاہتا ہے۔ لکھا سنگھ انکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ اُس نے کُرسی آگے کو کھسکاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ ”لکھو جناب! لکھا سنگھ۔۔۔۔۔ اجیت سنگھ، رنجیت سنگھ“ کمرے میں کوئی چیز بے چمنائے سے ٹوٹ گئی۔ ہر چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آنے لگے۔ رنجیت سنگھ

اُس نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے وہیں سے ضمانت قبل از گرفتاری کروالی۔

قتل

صبح کا وقت تھا میں دُھوپ میں بیٹھا ایک حوالاتیہ سے کمر کی مالش کروا رہا تھا کہ بلال شاہ بجے بجے دُگ بھرتا اندر داخل ہوا۔

”خاں صاحب! پیسے لفافوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ کوئی اور۔۔۔۔۔“ میرے منہ سے ایک موٹی سی گالی نکل گئی۔

اُس نے چونک کر حوالاتیہ کی طرف دیکھا اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ میں نے حوالاتیہ کو اٹھادیا۔ اتنے میں اے ایس آئی گویندر بھی آگیا۔ بلال شاہ نے پھر وہیں سے رابطہ جوڑا۔

”خاں صاحب! پیسے لفافوں نے کمال ہی کر دیا“

میں نے اُسے بھاڑتے ہوئے کہا۔ اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھو مجھے خون خرابے کی بو آ رہی ہے۔ کتنی بار آدمی کا کہا اتنی جلدی سچ ثابت ہوتا ہے کہ خود اُسے حیرانی ہونے لگتی ہے۔ ابھی بلال شاہ نے میری بات کے جواب میں کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ گاؤں کا پٹواری اندر داخل ہوا۔

”خاں صاحب! پتی حویلی میں قتل ہو گیا۔ رات کسی نے لکھا کے بیٹے زبیر کو مار دیا۔“ گویندر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اُسے فوراً حویلی پہنچنے کا حکم دیا۔ وہ سیڈیٹ مارکر سپاہیوں کی طرف چلا گیا۔ میں وردی پہن کر قریب اُس منٹ بعد حویلی پہنچا۔

لکھا سنگھ دروازے پر ہی مل گیا۔ وہ اپنے سفید رنگے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر رورہا تھا

انتے تھے کہ ماکہ کی نسبت لاکھ سے میری سلام دعا زیادہ تھی۔
مجھے ان باتوں کی پرواہ نہیں تھی۔ میں صرف قانونی تقاضے پورے کرنا چاہتا تھا۔
راہیوں اور شواہد سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ ماکہ یا اُس کے بیٹے قتل میں شریک نہیں
ہوئے۔ ماکہ اور اس کا بڑا بیٹا شرتار تاج بھگتے گئے ہوئے تھے جبکہ دونوں چھوٹے بیٹے رنجیت
اور دلجیت قتل ہونے کے دو گھنٹے بعد تک ایک شادی والے گھر میں موجود تھے۔ وہاں
”ای کا ناچ“ ہو رہا تھا جو رات دو بجے ختم ہوا۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق قتل کیا اور
ان کے درمیان ہوا تھا۔ وقتی طور پر صرف ایک گواہی نے مجھے شک میں ڈالا۔ یہ
گواہی مقتول کی بھابی پریم لکھی تھی۔ اُس نے تفتیش کے دوران بتایا تھا کہ قتل والی رات
میں تمام مقتول اور اس کے بچا زاد رنجیت کے درمیان پھر کسی بات پر ٹوٹوٹوئیں میں ہوئی
تھی۔ ہر حال گاؤں کے کئی معتبر آدمیوں کی گواہیوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ تمام
گواہیاں بتاتی تھیں کہ رنجیت اور دلجیت رات ڈھاتی بجے تک شادی والے گھر میں
موجود تھے۔

یوں تو لاکھا سنگھ کے کئی مخالف تھے لیکن خاص طور پر کسی پر بھی شک نہیں کیا جاسکتا
تھا۔ زیند عرف کھن کا قتل بدستور مقدمہ بنا ہوا تھا۔ میرا دھیان بار بار گناہم خطوں کی طرف
پلایا جاتا تھا۔ لاکھا اور ماکہ دونوں نہیں جانتے تھے لیکن مجھے معلوم تھا کہ ان کا کوئی مشترکہ
دشمن ان کو برباد کرنے پر تیار ہوا ہے۔ گناہم خط کھنے والے نے لاکھا اور ماکہ دونوں
کی خبری کی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ ان دونوں پارٹیوں میں سے نہیں تھا۔ حالات کو سامنے
رکھتے ہوئے تین امانتے قائم کئے جاسکتے تھے ممبر ایک یہ قتل اسی خبر سے کیا ہے۔ ممبر دو خبر کی خواہش کے
میں مطابق لاکھا سنگھ کے بیٹوں نے مشتعل ہو کر قتل کیا ہے۔ ممبر تین یہ لاکھا ماکہ سنگھ کے کئی اور مخالف

ہیں۔ ”تایا ہوش میں تو ہو“ لاکھا سنگھ کا چہرہ خوفناک ہو رہا تھا۔ وہ دانت پسین کر رہا تھا
”حرامزادوں میں تمہاری بوٹیاں کر دوں گا۔ اُس نے تین چار زوردار تھپڑ اس کے منہ پر
مارے۔ اتنے میں مقتول کا بڑا بھائی راجندر کرپان تان کر اس پر بھینٹا۔ اس سے پہلے
کہ خون خرابہ ہو جاتا میں نے اے ایس آئی اور سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے تیزی سے
آگے بڑھ کر مشتعل افراد کو گرفت میں لے لیا۔ ماکھا سنگھ بڑے بھائی سے چیخ کر کہہ رہا تھا۔
”بھائی! تو نے ہم پر تک کیا ہے۔ تو نے باپ کی قبر کی مٹی اڑاتی ہے“ لاکھا سنگھ
کا بڑا بیٹا راجندر سپاہیوں کی گرفت میں تڑپ تڑپ جا رہا تھا۔ کرپان ابھی تک اس
کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر کرپان اُس کے ہاتھ سے چھین لی۔

مجرم کی تلاش

لاکھا اور ماکہ کی لڑائی اور پھر ان کی عیلمندی گاؤں کے تاریخ کے اہم واقعات
تھے۔ دونوں بھائیوں میں بڑا برا ہو گیا۔ اور دونوں گھروں کے افراد ایک دوسرے کے
خون کے پیاسے ہو گئے۔ ماکھا سنگھ اپنے بھائی سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوا۔ اور اُس
نے حویلی سمیت بہت سی نقد رقم اپنے حصے میں ڈھالی۔ قرضوں کا زیادہ بوجھ بھی لاکھا سنگھ
کو ہی اٹھانا پڑا اور اوپر سے مقدمے بازی۔ زیند عرف کھن کی موت نے اس کی کمر
توڑ دی تھی وہ اس کا سب سے ہوشیار لڑکا تھا۔ پیداوار بھی گھٹ گئی۔ مخالف
اٹھانے لگے اور کھا سنگھ کی حالت پتلی ہونے لگی لیکن اُس کی ”دھاکڑ“ میں کوئی فرق نہیں
آیا تھا۔ اس کا بیٹا راجندر لوگوں سے کتا پھرتا تھا کہ میں نے ماکھا سنگھ کی طرف داری کی ہے
اور اُس کے بیٹوں کو جان بوجھ کر قتل میں ملوث نہیں کیا حالانکہ ”اٹھرا“ گاؤں کے لوگ

کالا ہے۔ اگر میں نے صرف کارروائی ڈالنا ہوتی تو مشکوک افراد میں سے چند کو گرفتار کر کے چالان بکل کر سکتا تھا لیکن میں حقیق قاتل کا سراغ لگانا چاہتا تھا تقریباً دو ماہ کی آکھاب شکن دوڑ دھوپ کے بعد یہ بات سامنے آئی تھی کہ اور پرتام کے گئے آخری دونوں اندازے درست نہیں تھے۔ اب صرف پہلا اندازہ کی حقیقت کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا۔ اس اندازے کے مطابق گناہ خیر خود اس قاتل کا ذمہ دار تھا۔ غطوں سے یہ بات ظاہر تھی کہ گناہ خیر لاکھا اور ماکھا کا کوئی نہایت قریبی شخص تھا۔ یہ بھی بعید از امکان نہیں تھا کہ وہ اکثر و بیشتر اُن کے گھر آتا جاتا رہتا ہو۔ اُس نے کئی ایسی اطلاعات دیں تھیں۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف اُن کا کوئی قریبی ساتھی ہے بلکہ صبح و شام اُن کی ٹوہ میں رہتا ہے۔ پتی جوہلی میں بتوارے سے پہلے لاکھا اور ماکھا اپنے اپنے اہل خانہ کے ساتھ دو علیحدہ حصوں میں رہتے تھے۔ لاکھا والے حصے میں کل سات افراد رہتے تھے۔ ان میں لاکھا اس کی بیوی ایک بہو اور چار بیٹے شامل تھے۔ چھوٹے بھائی ماکھا والے حصے میں چھ افراد رہتے تھے یعنی لاکھا اس کی بیوی تین بیٹے اور ایک نوکرانی۔ تمام حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے پتی جوہلی کے ان تیرہ افراد میں سے صرف نوکرانی پر شک کیا جاسکتا تھا۔ نوکرانی جس کا نام چھیموں تھا۔ چھیمیں چھیمیں سال کی ایک میلی کچلی لیکن خوبصورت عورت تھی۔ میں پوچھ گچھ کے لئے اُس سے ایک بار مل چکا تھا۔ پچھلے پڑنے کپڑوں کے نیچے اُس کا بھر لوہا جسم کسی کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس کے چہرے میں اس کے سفید دانت سب سے زیادہ خوبصورت تھے۔ وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ بڑا بچہ کوئی بارہ سال کا تھا۔ اس کا خاوند راج گیری کرتا تھا۔ مجھے خبر تھی کہ کنوارے مردوں کے گھر میں ایک جوان خوبصورت عورت کی موجودگی کئی کہانیاں جنم دیتی ہے۔ ایسی ہی کسی کہانی کی ٹوہ کے لئے میں نے گاؤں کی دانی بھانگاں سے کام لینے کا ارادہ کیا۔

ایا۔ بھانگاں پہلے ہی میرے ایک دو کام کر چکی تھی۔ میں نے اس سے نوکرانی چھیموں کا کیا تو اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پہلے ہی سے چھیموں کے بارے میں کچھ جانتی ہے۔ میرے پوچھنے پر اُس کی زبان فغنی کی طرح چلنے لگی۔ اُس نے لایا کہ مقتول زیندہ نے نوکرانی چھیموں سے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ وہ اکثر اپنے باکے گھر میں گھسا چھیموں سے آنکھ مٹکا لڑتا رہتا تھا۔ چھیموں کا خاوند کام کے سلسلے میں گاؤں سے باہر رہتا تھا اور مہینے میں دو تین بار ہی گھر کے چکر لگاتا تھا۔ یہ معلومات میرے نہایت سودمند تھیں۔ آگے بڑھنے کی ایک راہ پیدا ہو گئی تھی۔

نوکرانی مشکوک تھی

دانی بھانگاں نے واقعہ اپنے انداز میں بیان کیا تھا لیکن اس کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی بہت ممکن تھا کہ زیندہ کی دست درازیوں کا شکار ہونے والی دو بچوں کی ان چھیموں نے انتقام لینے کا فیصلہ کیا ہو۔ اس نے موقع پا کر اپنی عورت کے قاتل انہم کر دیا ہو۔ دیکھا گیا ہے کہ باحیثیت گھرانوں کے ملازمین اپنے پرہونے والی ادنیوں کو بعض اوقات ایک سرد انتقامی جذبے کی صورت میں دیتے ہیں اور موقع ملے ہی ”گھر کا بھیدی“ لٹکا ڈھا دیتا ہے۔ ہو سکتا تھا یہ بھی کوئی اسی قسم کا واقعہ ہو۔ میں نے اگلے روز پھر نوکرانی چھیموں سے پوچھ گچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی میں وردی میں ”پتی جوہلی“ جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مقتول کا چھوٹا بھائی سریندر تھلانے میں آبل ہوا۔ اُس کی عمر کوئی بائیس سال رہی ہوگی۔ گول سرخ چہرے اور اچھے ڈیل ڈال اٹا تھا لیکن اُس وقت اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ سخت پریشان دکھائی دیتا

تھا۔ سلام کا جواب دے کر میں نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”کیا بات ہے باؤ؟ کسی سے لڑھکھوکھو کر تو نہیں آتے“ میں نے اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے کہا۔

”نہیں خاں صاحب“ اُس نے سر کھاتے ہوئے کہا۔ ”در اصل مجھے بڑا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔“

میں نے اسے کہا کہ میں کہیں جا رہا تھا میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اُس نے جو کچھ کہنا ہے کُل کر کہے۔ وہ کھنکھار کر بولا۔ ”اے آپ چاہے ماکھے کے پتروں کو سنبھال لیں یا پھر یہاں خون خرابہ ہوگا۔“

”کیا کوئی نئی بات ہوتی ہے؟“ میں نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

اس نے کہا ”جناب کوئی رات ہمارے گھر میں پھرتا رہا ہے میں اُوپر چوہارے میں سوتا ہوں۔ پہلے کوئی کھڑکی ہلاتا رہا۔ کھڑکی اندر سے بند تھی۔ پھر کچھ آدمی کمرے کی چھت پر گھومتے رہے۔ بد قسمتی سے میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ میں نے اُن سے اُلجھنا مناسب نہ سمجھا۔ اس سے پہلے پرسوں رات بھی اس قسم کی آوازیں آئی تھیں۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔“

میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن خوف اُس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ میں نے اُسے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

”جو ان ہو، کوئی چوہے تو نہیں ہو۔ اتنا گھبرا کیوں رہے ہو۔ حوصلہ رکھو۔“

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے حویلی کا رُخ

کیا۔ لاکھا سنگھ گھر پر ہی تھا۔ میں نے اس کے ذریعے چھپیوں کو بلوایا۔ خاص طور سے بلواتے جانے پر وہ بڑی خوف زدہ دکھائی دیتی تھی۔ پہلی ملاقات میں اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ قتل کی رات حویلی ہی میں تھی۔ کام زیادہ ہونے پر وہ حویلی ہی میں سو رہی تھی۔ اس کے بچوں کو اس کی ساس اور نندیں سنبھالتی تھیں۔ اس دفعہ میں نے اُس سے زیندر کے حوالے سے کچھ سوال کئے۔ وہ کافی خوف زدہ دکھائی دیتی تھی۔ حسب توقع اس نے کہا کہ وہ اسے دیر گھنٹی تھی۔ لیکن میں نے یہ سوال نہیں کیا کہ وہ اسے کیا سمجھتا تھا۔ اس سوال کا جواب اس کی جھکی ہوئی آنکھیں اور کانپتے ہوئے ہونٹ دے رہے تھے کوشش کے باوجود پون گھنٹہ کی گفتگو میں اس سے کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ ادیب لوگ مندر سے زیادہ گہری عورتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ بھی اُن ہی میں سے ایک تھی۔ ”پکی حویلی“ میں سیدھا لاکھا سنگھ کے مکان پر گیا۔ یہ مکان اس نے نیا بنوایا تھا۔ یہ بھی ایک کافی رامکان تھا۔ اس کی دو نرلیں تھیں اور وقت کے مطابق اس کو نئے فیش کا مکان مابجاستا تھا۔ لاکھا سنگھ خود ڈیرے پر گیا ہوا تھا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا بیٹا اجندر گھر پر ہی تھا۔ میں نے اس کی بیوی یعنی منقول کی بھابھی کو بلوایا۔ اس نے سب سے پہلے منقول کی لاش دیکھی تھی۔ بھابھیاں اپنے دیوروں کے بارے میں بہت سی لمبات رکھتی ہیں۔ میں نے اس سے چھپیوں اور زیندر کے تعلقات کے بارے میں پوچھ کر پوچھ کر کچھ سوال پوچھے۔ پہلے تو وہ جھجکتی رہی۔ پھر بتدریج میرے سوالوں کے اب دینے لگی۔ وہ ایک ذہین عورت تھی اور لگتا تھا کہ میری تفتیش کے رُخ کو سمجھ رہی ہے۔ اُس نے ایک نہایت کام کی بات یہ بتائی کہ قتل سے چند روز پہلے چھپیوں کے خلاف ہونے والی ملاقات کے بعد لاکھا سنگھ کے گھر میں

باہر ایک دو سپاہی لٹکا دیتے جاتیں صبح میں اُس کے بیٹے کا ”بھراپن“ اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ موت کے خوف سے بیچارے کی صورت بگڑی ہوئی تھی۔ بہر حال میں نے رات کے وقت دو سپاہی بیٹھنے کا وعدہ کر لیا۔

ایک اور خط

نوکرانی چھپوں مشکوک ہو چکی تھی اور میں اپنے مخبروں بلال شاہ اور ذاتی بھالکان کے ذریعے اس کے بارے میں تیزی سے معلومات حاصل کر رہا تھا لیکن سوچنے کی بات تھی کہ جیسا کہ یہ ثابت ہو گیا تھا۔ قتل صرف ایک آدمی کا کام ہے، نوکیلا چھپوں ایک ہی کام کر سکتی تھی۔۔۔۔۔ لیکن دوسرے دن ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے حالات کا رخ ایک بار پھر موڑ دیا۔۔۔۔۔ لاکھانگھ کے نئے مکان میں اُس کا دوسرا بیٹا سریندر قتل ہو گیا۔ اس قتل سے پورے علاقے میں سراپا سیگی پھیل گئی۔ سریندر سنگھ اپنے مکان کی دوسری منزل میں بند کمرے میں سویا ہوا تھا۔ مکان کے باہر دو پولیس والے پہرہ دے رہے تھے لیکن قاتل اپنا کام کر گیا۔ جس کمرے میں قتل ہوا اس کی دو کھڑکیاں تھیں اس کے علاوہ کمرے کے موٹے تختوں کا انگریزی دروازہ تھا۔ جو اندر سے دو چٹخیاں لگا کر بند کیا گیا تھا۔ ایک کھڑکی دروازے کے ساتھ تھی وہ بھی اندر سے بند تھی۔

دوسری کھڑکی کمرے کے پتھر والے میں تھی۔ یہ کھڑکی زمین سے کوئی بیس فٹ بلند تھی۔ مین کابرنالہ کھڑکی کے پاس سے گزرتا تھا۔ کسی آدمی کا اس پر نالے کے ذریعے اوپر چڑھنا جان جو کھوں کا کام تھا لیکن قاتل نے یہ کام کر دکھایا تھا اور اُس کھڑکی سے کمرے کے اندر کود کر سریندر کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ لاش کچھ دیر اس کے پاس

اُس کی باتوں سے میرے اس خیال کی بھی تصدیق ہوئی کہ چھپوں سے زربندر کے تعلقات بہت حد تک یک طرفہ تھے۔ بقول اس کی بھابی کے اُس چڑیل نے اُس کے دیور کی عقل مار دی تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر میں واپس تھانے آ گیا۔ آگے لاکھانگھ بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں تو خود اُس کے گھر گیا ہوا تھا۔ میں نے اُسے اب تک کی تفتیش کے بارے میں بتانا مناسب سمجھا وہ اپنی جھکی ہوئی بڑی بڑی سفید بوچھوں کو بل دیتے ہوئے سُٹا رہا۔

میں نے اُسے گمنام خطوں سے لے کر اُس کی بہو پر تیم سے ملاقات تک کے تمام چیدہ چیدہ واقعات بتائے۔ میں نے کہا۔

”چوہدری لاکھے میں اسی لئے کہتا تھا کہ یہ قتل کسی ایسے شخص کا کام ہے جو تم دونوں بھائیوں کا دشمن ہے“ گاؤں کے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جو بات ایک بار اُن کے ذہن میں بیٹھ جائے پھر وہ کبھی کبھار نہیں لیتی۔ لاکھے کے ذہن میں بھی یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ لاکھا اُس کا دشمن ہے۔ اور یہ قتل اُس نے یا اس کے بیٹوں نے کیا ہے۔ میری تمام باتیں سننے کے بعد بھی اُس نے وہی میں شروع کر دی۔ اُس نے کہا: ”خاں صاحب اگر آپ کی تفتیش کے مطابق لاکھے کی نوکرانی چھپوں کا اس قتل میں ہاتھ ہے تو بھی یہ لاکھے ہی کا کام ہے۔ اصل کھیل اسی کا ہے اور اُسی نے کھیلایا ہے۔ میں کوئی اور بات مان ہی نہیں سکتا۔“ میں نے ہنٹ دھری کے اس پتھرے اور سر پھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور خشک لہجے میں پوچھا کہ وہ کس کام کے لئے تھلے آیا ہے۔ اس نے بھی وہی بات دہرائی شروع کی جو صبح اس کا بیٹا کر گیا تھا۔ لاکھے کا کہنا تھا کہ اس کا بیٹا بہت بھرا ہوا ہے کوئی خون خرابہ ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ گھر کے

تھا اور لاکھا سنگھ میرے پاس بیٹھا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”مجھے خدا سمجھے چوہدری، سارے تھانے کی نیندیں حرام کر دی ہیں تو نے اور تیرے پتروں نے۔ جسے کوئی اور بھگتے کوئی ٹانگیں ٹوٹ گئیں میری تو،“

کمرے میں پہنچ کر اس نے لاکھا سنگھ کو میرے پاس بیٹھے دیکھا تو وہ ایک لمبے کے لئے ٹھٹھکا۔ بات بدلنا بلال شاہ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بغیر کے بولتا چلا گیا۔

”خدا غارت کرے ایسے پتروں کو اور ایسے پتر جتنے والے باپ کو، میرے بس میں ہوتا تو ایک رات میں پھاتے لگا دیتا چاروں باپ بیٹوں کو،“

لاکھے کی باتیں اُس نے کمال صفائی سے ماکھے کے کھاتے میں ڈال دیں تھیں۔

مجھے یقین ہے اگر اُس نے لاکھے کا نام لے کر بھی اُسے کوسا ہوتا تو بھی کوئی بات بنالینا۔ خیر..... میں نے اُسے گھور کر دیکھا اور کہا کہ کام کی بات کرو جس کام کے لئے تمہیں بھیجا تھا اُس کا کیا بنا؟ اُس نے پہلے ایک بار پھر اپنی ٹانگوں کا رونا روپا

پھر بتایا کہ ساری بھاگ دوڑ بیکار گئی۔ ”بلا،“ تو تین چاروں سے گاؤں ہی میں موجود تھا۔ میں نے دراصل اُسے چھیموں کے خاوند تلے کی کھوج میں امرتسر بھیجا تھا۔

وہاں اُس کے ٹھکانے سے بلال شاہ کو یہ پتہ چلا تھا کہ بلا تو گاؤں گیا ہوا ہے۔ اس کا مطلب تھا قاتل کی رات بلا گاؤں ہی میں موجود تھا۔ یہ بات اُسے اور بھی مشکوک کرتی تھی۔ میں نے اس رُخ پر سوچنا شروع کیا۔

بیوی کے چال چلن پر تلے کو شبہ تھا۔ اُس نے بیوی کو مارا بھی تھا۔ یہ سلسلہ کافی دیر سے چل رہا تھا لیکن بلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ آخر اُس نے درپردہ انتقام کا راستہ

پڑی تھی جیسے پہلی واردات کے موقع پر تھی۔ مقتول کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں کیس کھٹے تھے۔ اور گلا کسی تیز دھار آلے سے کٹا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں ہی میں نے محسوس کر لیا کہ نرمیدار اور سریندر کا قاتل ایک ہی ہے۔

قتل کی پہلی واردات نسبتاً آسان تھی لیکن دوسری واردات میں قاتل نہ صرف یہ کہ پولیس کے مسلح آدمیوں کو چمکے دے کر گھر میں داخل ہوا تھا بلکہ ایک نہایت مشکل راستے سے مقتول کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ ظاہر تھا یہ کسی عورت کا کام نہیں۔ قاتل کے فوراً بعد میں نے لاکھا اور اس کے بیٹوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ خون خرابے سے بچنے کے لئے یہ نہایت ضروری تھا۔ ایک ماہ کے اندر اندر ایک ہی گھر کا یہ دوسرا فرد قتل ہو گیا تھا اور قاتل کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ میں اپنے کندھوں پر زبردست بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ میرا عمدہ چاروں طرف بھاگ دوڑ میں مصروف تھا اور میں اپنی نامتو فرنیچر صلیہ قاتل تک پہنچنے کے لئے صرف کر رہا تھا۔ یہ ایک عام ڈگر سے ہٹا ہوا کیس تھا اور اس کے لئے مجھے قدرے مختلف انداز سے سوچنا پڑ رہا تھا۔ اُس وقت میں تھانے میں مقتولین کے باپ چوہدری ماکھے سے گفتگو کر رہا تھا کہ اے ایس آئی گو بند کچھ کاغذ لے اندر داخل ہوا۔ میں اُس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر دیکھنے لگا۔ اس پر گاؤں اور اردگرد کے قریبائیس افراد کی تحریروں کے نمونے تھے۔ یہی وہ افراد تھے جو اس ماہ علاقے میں کچھ لفظ لکھ سکتے تھے۔ ان میں سے کوئی تحریر بھی گنہام خطوں کی تحریر سے میل نہیں کھاتی تھی۔ آخر وہ کون شخص تھا جو گنہام خط لکھتا تھا۔ کون تھا وہ؟

اتنے میں دُور سے بلال شاہ کی آواز سنائی دی۔ وہ حسب معمول بلند آواز پر بولتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ اس وقت وہ لاکھا سنگھ کی شان میں قصیدے کہہ رہا

اختیار کیا اور اپنے خنوں کے ذریعے پہلے دونوں خاندانوں میں پھوٹ ڈلوائی اور پھر لاکھا سنگھ کے بیٹوں کو قتل کر دیا۔ لیکن پتی حویلی کے اندر کی باتیں اُسے کیسے معلوم ہوتیں — ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ یہ دونوں میاں بیوی کا مشترکہ منصوبہ ہو۔ خنوں کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا تھا۔ بلاچنک کام کے سلسلے میں گاؤں سے باہر رہتا تھا اس لئے خط لکھ کر یا کسی سے لکھوا کر ڈاک سے بھیجتا رہتا تھا —

میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ چودھری لاکھا اور بلال شاہ سامنے کرسیوں پر گم غم بیٹھے تھے۔ میں نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔ اس کیس نے مجھے اچھا خاصا پریشان کر دیا تھا۔ لاکھے نے مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر کہا۔

”دعا صاحب! مجھے اب اُس مکان کے در و دیوار سے وحشت ہونے لگی ہے۔ میری بیوی بھی بہت خوفزدہ رہتی ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ مکان کے گرد پولیس کی نفری میں اضافہ کر دیں“ اوپر تلے دو جوان بیٹوں کی موت نے اُس کا

پہلے والا دم خم چھین لیا تھا۔ اُس کی مالی حالت بھی دن بدن خراب ہو رہی تھی۔ میں نے کہا ”چودھری چھ مہینے آدھی تیرے گھر پر دن رات پہرہ دے رہے ہیں۔

جن پر تجھے زیادہ شک تھا وہ بھی سب حوالات میں ہیں۔ اب ڈر کس بات کا؟ لاکھا اس جواب پر خاموش ہو گیا۔ مجھے چوری کے ایک اور کیس کے سلسلے میں جانا

تھا۔ میں اُٹھ کر تیاری کرنے لگا۔ اتنے میں جو وہ پور کا پوسٹ ماسٹر دروازے پر نظر آیا۔ میں آگے بڑھ کر اسے فوراً دوسرے کمرے میں لے گیا۔ جو وہ پور

کے ڈاک خانے کی نگرانی ہو رہی تھی لیکن پھر بھی مخبر پکڑا نہیں جاسکتا تھا۔ اُس نے صرف ایک دن پہلے ایک نفاذ سپرد ڈاک کیا تھا، اور وہ نفاذ پکڑے

ٹ ماسٹر میرے سامنے کھڑا تھا۔ بہر حال ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ میں نے نفاذ لاکھا۔ کاپی کے ایک چھوٹے سے صفحے پر بعینہ یہ الفاظ لکھے تھے۔

”شب برات سے پہلے پہلے لاکھا کے چھوٹے پتر کا کام مک جائے گا“

ان ٹیڑھے میڑھے حروف میں ایک خوفناک دھمکی پوشیدہ تھی۔ اُن دنوں دیسی ملازموں میں ایسے ڈاکوؤں کی کہانیاں بکثرت گردش کرتی رہتی تھیں جو کہ ڈاک ڈالنے پہلے اس کی اطلاع دے دیتے تھے۔ یہ شخص بھی کسی ایسی ہی کہانی سے متاثر نظر

آتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس شخص نے یہ خط لکھ کر لاکھا سنگھ کے گھر والوں کو مزید خوفزدہ کرنے کی کوشش کی ہے میں لاکھے کو خط کے بارے میں بتا کر خط بھیجنے والے کا مقصد اُن کا نام نہیں چاہتا تھا۔ پوسٹ ماسٹر کو رخصت کر کے میں واپس کمرے میں آ گیا۔

تنواری دیر میں لاکھے سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر میں نے کہا کہ اگر وہ ضروری بات ہے تو میں اُس کے گھر کی حفاظت کے لئے کچھ اور آدمی بھیج دیتا ہوں۔ وہ میرے اس وعدے سے مطمئن نظر آنے لگا۔

ایک اور لاش

شام کے وقت میں نے اے ایس آئی گوبندر کے ساتھ پانچ مسلح سپاہی اور بیج دیتے۔ میں نے گوبندر کو پوری طرح چوس کر رہنے کی تاکید کی۔ اس کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ چھیموں کے خاوند بٹے کو گرفتار کر لیا۔ وہ اٹھائیس انیس سال کا ایک دہلا پتلا شخص تھا۔ اس کے بال اور آنکھیں بھوری تھیں، اس کی لمبی لمبی نوک دار کوئیچیں دیکھ کر مجھے خواہ مخواہ طیش آ رہا تھا۔ میں نے پہلے تو اُس سے نرمی سے پوچھ گچھ

کی لیکن وہ ہر بات سے انکار کرتا رہا۔ وقت کم تھا اور مجھے فوری معلومات درکار تھیں۔ میں نے سپاہیوں کو اس کی مرمت کرنے کا حکم دیا۔ دو گھنٹے تک تھوڑا ڈگری کے استعمال کے باوجود اس سے کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی تو میں نے مار پیٹ کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

لاکھا کے گھروہ رات تو بھریت گزر گئی۔ شب برات میں ابھی ایک دن باقی تھا۔ اگلے دن شام کے بعد میں نے خود لاکھے کے مکان کے گرد حفاظتی انتظامات کا جائزہ لیا۔ انتظامات ہر طرح سے مکمل تھے اور اگر قاتل کوئی جج بھوت نہیں تھا تو حفاظتی گارڈ کو حکمت دے کر گھر کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ میں تھانے میں تھا اور بتے سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے دفتر میں چلا گیا۔ کمرے کی عقبی کھڑکی کھلی تھی۔ یہاں سے دُور تک پھیلے کھیتوں کا سلسلہ صاف نظر آ رہا تھا۔ چاندنی بڑی خاموشی سے گاؤں کے مکانوں اور کھیتوں پر برس رہی تھی۔ میں کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ رات کے پچھلے پیر میرے اندر کا تھانیدار اُٹھنے لگا تھا۔ اُس وقت میں ایک عام آدمی کی طرح سوچ رہا تھا۔ میں سوچا اس گاؤں سے نہانے کتنی حسین و شیزا ہیں اپنے محبوبوں سے ملنے کے لئے ان کھیتوں تک آتی ہوں گی؟ کتنے شوخ فقرے اور شرمیلی سرگوشیاں ان کھیتوں میں بکھری ہوں گی۔ ان ہی کھیتوں میں چور چھپے ہوں گے۔ ڈاکوؤں نے لوٹ کا مال دیا ہو گا، قتل ہوئے ہوں گے، قبریں بنی ہوں گی، کتنی بے چین رُوحیں اب بھی ہاں بھٹک رہی ہوں گی۔ اچانک اے ایس آئی گو بندر بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔۔۔۔ لاکھا کے مکان پر پھر قتل ہو گیا تھا۔ گو بندر سنے بنایا

کہ تھوڑی دیر پہلے اندر سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ ہم بھاگتے ہوئے دہاں پہنچے لیکن قاتل اپنا کام کر چکا تھا۔ میں اسی وقت موقع واردات پر پہنچا۔ ایک برآمدے میں دو بھینسوں کے پاس ایک چارپائی پر راجندر کی لاش پڑی تھی۔ اُس کی گردن سے خون ٹپک ٹپک کر زمین پر تالاب کی صورت میں جم چکا تھا۔ مقتول کے دائیں ہاتھ کی تین انگلیاں بھی کٹی ہوئی تھیں۔ اس دفعہ قاتل آسانی سے اپنا کام نہیں کر سکا تھا۔ راجندر کے جائزے سے پتہ چلتا تھا کہ دہاں کچھ دھینگا مشتی بھی ہوئی ہے۔ چارپائی کے پاس پانی کا ایک گھڑا ٹوٹا تھا اور محاف بھی فرش پر گر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے قاتل نے حسب سابق پھری سے حملہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مقتول جاگ گیا تھا اور اس نے مزاحمت کی تھی۔ بعد میں قاتل نے اس کے سر ہانے رکھی ہوئی بندوق پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی پہلی گولی تو چھت بھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ لیکن دوسری گولی نے مقتول کا کام تمام کر دیا تھا۔ یہ گولی اس کی ٹھوڑی میں داخل ہو کر سر کے پچھلے حصے سے نکل گئی تھی۔ گھروالوں کے پہنچنے تک قاتل فرار ہو چکا تھا۔ مقتول کی بندوق بھینسوں کی کھڑکی سے برآمد ہوئی تھی۔ یہ بھینسوں کی خوراک میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اور اس کے دستے پر انگلیوں کے نشان پاتے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے گاؤں کے کھدجی کو بلوایا لیکن اس دفعہ بھی وہ کوئی اہم کھڑا اٹھانے میں ناکام رہا۔ گھر کی عورتیں بلند آوازیں بین کر رہی تھیں۔ اور ان آوازوں کی شدت میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔ میری طبیعت سخت کد رہ گئی۔ میں اے ایس آئی گو بندر کو فوری احکامات دے کر تھانے لوٹ آیا۔

پیریتم کہاں سے آگئی

اُس رات میں بالکل نہیں سو سکا۔ کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ اس کیس کے تمام

مشکوٰۃ کرداروں کو پھڑکھڑاتھلے میں لے آؤں اور اُن پر اس وقت تک سختی کروں جب تک قاتل کا پتہ نہ مل جاتے۔ حالات بہت بگڑ گئے تھے۔ اور کسی بھی وقت اعلیٰ افسروں کی طرف سے طلبی ہو سکتی تھی۔ چھیموں کا خاوند بلا ابھی تک بند تھا۔ سہ پہر کے وقت اُس کی بیوی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ روٹی ہوئی تھانے آگئی۔ اُس نے میرے پاؤں پھڑکتے اور بچوں کا واسطہ دے دے کر کہنے لگی کہ میں اُس کے خاندان کو چھوڑ دوں۔ بٹے کو پھڑکے رکھنے کا اب کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ غریب آدمی کو پانی پینے کے لئے ہر روز کنواں کھودنا پڑتا ہے۔ اگر وہ چند دن اور حالات میں رہتا تو بچے بھوکوں مرنے لگتے۔ میں نے اُسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اپنا کم میں چونک گیا۔ بڑا لڑکا جس کی عمر کوئی بارہ سال تھی۔ ہاتھ میں کتابیں پیٹے ہوئے تھا۔ شاید

اس کی ماں اسکول سے سیدھا اُسے یہاں لے آئی تھی۔ کتابوں کے اوپر خنکی کاغذ کے کور چڑھے ہوئے تھے اور اُن پر سیاہ روشنائی سے نام وغیرہ لکھا تھا۔ ”گلزارِ احمد“.....
جماعتِ ششم..... ”گلزار کے ”گ“ پر میری نظر اُٹک کر رہ گئی۔ گ کے دونوں ڈبٹے سیدھے نہیں تھے۔ بلکہ مخصوص انداز میں ہر اک لکھا گیا تھا۔ ایسا ”گ“ میں نے کہاں دیکھا تھا؟ اور پھر جیسے مجھے کرنٹ سا لگا۔ اس طرح کا حرف گمنام خطوں میں تھا۔ میں نے میز کی دراز سے وہ تمام خط نکال لئے۔ پھر میں نے لٹکے سے اس کی کاپیاں لیں اور تحریر کا موازنہ کرنے لگا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کاپیوں اور خطوط کی تحریر یکساں تھی۔ میں نے گھور کر لٹکے کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس کیا اور خط اس کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

”یہ خط تم نے لکھے ہیں“ لڑکا خاموش رہا۔ میں نے اپنا سوال بھر دہرایا لیکن وہ خاموش

یہ تمام خطوط اُس سے لاکھے کی بہو پریم نے لکھوائے تھے۔ (دیکھا پتہ چلی میں اپنی ماں کے پاس آتا ہمارا ہوتا تھا۔ پریم موقع ملنے پر اُس سے چند لائنیں لکھوا لیتی تھی۔ کچھ دنوں اپنے میکے کے لئے لکھواتی تھی اور کچھ اسی گاؤں کے لئے۔ گزارا روزانہ بس پر رہا۔ میں کاسفر کر کے جو دھڑ پور قصبہ میں پڑھنے جاتا تھا۔ وہ ہی ان خطوں کو لیٹر بکس میں ڈال دیا کرتا تھا۔ مجھے ایک ایک کر کے پچھلے واقعات یاد آنے لگے کہ کس طرح افسے کی بہو نے دو موقعوں پر میری تفتیش کو غلط رخ پر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ دفعہ اس نے رنجیت کو ملوث کرنے کی کوشش کی تھی اور دوسری دفعہ چیمپوں اُس کے خاوند کی لڑائی کا ذکر کر کے میرے شکوک کو پختہ کیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن وہ اپنی صورت سے تو ایسی عورت نظر نہیں آتی تھی۔ کیا وہ اپنے ہاتھوں اپنے خاوند کی موت کر سکتی تھی۔ کیا اُس نے اکیلے تین مردوں کو قتل کیا تھا؟ اگر اس کے ساتھ کوئی ایک تھا تو کون تھا؟ مجھے بہت سے سوالوں کے جواب چاہئیں لیکن بہت لمبے وقت میں۔ میں نے اسے ایس آئی گویندر کو حکم دیا کہ وہ بٹے اور اس کے بی بی بچوں کو تھانے میں رکھے۔ میں نے چیمپوں سے پریم کے میکے کا پتہ دریافت کر لیا اور گھوڑے پر کاٹھی ڈال کر روانہ ہو گیا۔ میرے ساتھ صرف بلال شاہ تھا چار دنوں کے سفر کے بعد شام قریب اچھنچے ہم ”سراہ والی“ گاؤں پہنچے۔ اس گاؤں

میں ہمارا ایک تجربہ موجود تھا۔ میں سیدھا اُس کے پاس گیا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ میں لاکھا کی بہو کے بارے میں معلومات چاہتا تھا۔ تجربہ جس کا نام بوٹا تھا۔ اس بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ گاؤں کے ایک اور شخص کو لے آیا۔ یہ گاؤں کا باقی تھا۔ اور بڑا تیز و طرار آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے ایک گھنٹے میں پریم کی زندگی کی پوری کتاب ہمارے سامنے کھول دی۔

لاڈال پٹی

اُس کی باتوں سے پتہ چلا کہ پریم گاؤں کے چوہدری کی اکلوتی اولاد ہے۔ پریم کو جنم دے کر اُس کی ماں مر گئی۔ چوہدری نے اُسے بڑے لاڈ پیار سے پالا۔ بے جا محبت نے اُسے بگاڑ دیا۔ وہ بہت خود سر اور زبان دراز ہو گئی۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں اُس نے اپنی شراقتوں سے گاؤں بھر کا ناک میں دم کر دیا وہ راہ چلتوں کی پچھڑی کھینچ لیتی۔ گلی میں سوتے ہوئے لوگوں کی چارپائیاں اُلٹ دیتی۔ وہ کوٹھے پھیلا نکلتی ہوئی گھروں میں گھس جاتی۔ لوگوں کے دودھ پی جاتی اور ان میں کچھڑ گھول دیتی۔ گاؤں کی ایک بھاری بھر کم عورت سرداراں تندہروالی سے اُسے خاص بیر تھا۔ اسے جہاں دیکھتی دھکا دے کر زمین پر گرا دیتی۔ اپنے بھاری بھر کم جسم کی وجہ سے سرداراں کو اُٹھنے میں کئی منٹ لگ جاتے۔ اس عرصے وہ اُس کے پاس کھڑی تھبتھبت لگاتی رہتی۔ کسی کو جرات نہیں تھی کہ کسی بات پر اُسے ٹوکتا۔ سب ہنس کر یار و کر چپ ہو رہتے۔ اس کے سب کھیل لڑکوں جیسے تھے۔ گلی ڈنڈا کھیلنا، گولیاں کھیلنا، لڑکیوں اور بعض اوقات لڑکوں سے زور آزمائی کرنا، چوہری اُس کا محبوب مشغہ تھا۔ وہ

باغ میں گھس جاتی اور پھل کا ستیاناس کر دیتی۔ اُونچے اُونچے درختوں پر وہ بلی کی طرح چڑھ جاتی تھی۔

چوہری کی عادت اُس میں اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ ایک بار اُس نے چوروں کی باقاعدہ ڈھانا باندھ کر گاؤں کے ایک گھر سے زیورات چُرالے۔ رفتہ رفتہ اُس کی محسوس ہونے لگا تھا کہ اُس کے بے جا لاڈ پیار نے پریم کو حد درجہ بگاڑ دیا۔ لیکن اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ وہ اگر اُسے کسی بات پر ٹوکتا تو وہ شتمل جاتی اور اگلے دن کوئی اس سے بھی بڑا کارنامہ انجام دیتی۔ لیکن پھر ایسا ہوا۔ پریم کی زندگی میں گاؤں کا ایک خوب رو جوان آگیا کچھ ایسے اتفاقات ہوئے کہ وہ اسے محبت کرنے لگی۔ یہ نوجوان جس کا نام نعمت علی تھا۔ اُسی سرداراں کا لڑکا۔ اسے پریم تنگ کیا کرتی تھی۔

پریم، نعمت علی کے چوڑے چھلے سینے اور گھونگھریالے بالوں پر ایسی ریختی کہ اُس پر چوڑی بھول گئی۔ جلد ہی گاؤں کے لوگ اُس میں ایک حیرت انگیز تبدیلی آنے کرنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لڑکے سے لڑکی بن رہی ہو۔ بول چال سے لڑکوں کی مصروفیات تک اس کا سب کچھ بدل گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے سکھ لیا۔ اُس لی اور دینی زبان میں نعمت علی کو دُعائیں دینے لگے جس نے اس منہ زور لڑکے کو لگام ڈالی تھی۔ پریم جو پہلے سرداراں تندہروالی کو دیکھتے ہی اپنی آنی پر جاتی تھی اب ہر وقت اُس کی خدمت گزار کی کا موقع تلاش کرتی رہتی۔

لڑکے پر اُس کا پانی بھرتی۔ گھر کے کچھواڑے اُس کے ساتھ اُپلے تھابتی۔ بعض اوقات تو اُس کے لئے ایندھن بھی اکٹھا کر کے لاتی۔ گاؤں کے لوگ ساری بات

سمجھتے تھے لیکن کسی سکھ، مسلمان یا ہندو کو اتنی جرات نہیں تھی کہ چوہدری کی بیٹی پر انگلی اٹھاتا۔

یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔۔۔۔۔ اور پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے پریتم سے سب کچھ چھین لیا۔۔۔۔۔ سرداراں کا تندہ گھر کے اندر ہی تھا۔ ایک رات شاید وہ اُسے ڈھانپنا بھول گئی۔ رات کو ہوا چلی اور تندہ کے قریب رکھے ہوئے ایندھن کے ڈھیر نے آگ پکڑ لی۔ چند لمحوں میں سارا گھر آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ گھر کے مکین سوتے ہوئے تھے۔ سرداراں اور نعمت علی سمیت آٹھ افراد میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ مرنے والوں میں بارہ سال سے کم عمر کے تین بچے بھی تھے۔ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ہی پریتم کی شادی ہو گئی۔

آتشزدگی کے اس واقعہ کے بارے میں میں نے پہلے بھی کہیں سنا تھا۔ حالات اور واقعات کی پوری تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ میرا ذہن تیزی سے مختلف کڑیوں کو جوڑنے میں مصروف تھا۔ دو صورتیں ہو سکتی تھیں۔ آگ اتفاقیہ لگی تھی یا جان بوجھ کر لگائی گئی تھی۔ یقیناً۔۔۔۔۔ یقیناً آتشزدگی کا واقعہ اتفاقیہ نہیں تھا۔۔۔۔۔ آگ جان بوجھ کر لگائی گئی تھی۔ لیکن کس نے لگائی تھی۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے یہ پریتم کے باپ کا کام ہو۔۔۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔۔۔ مجھ کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس قسم کا کام خود نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ پھر پریتم کے سسرال والوں پر بھی شک کیا جاسکتا تھا۔ لیکن شک نہیں یقین سے کہا جاسکتا تھا۔ یقیناً یہ لاکھے اور اس کے بیٹوں کا کام تھا۔ اس قسم کا کام وہی لوگ کر سکتے تھے۔۔۔۔۔ شادی کے بعد پریتم کو اس گھناؤنے فعل کا پتہ چلا ہو گا اور۔۔۔۔۔ اور وہ سرتاپا انتقام بن گئی ہو گی۔۔۔۔۔

محبوب کے لئے اُس نے اپنی زندگی بدل دی تھی وہ خدائی فوجداروں کے انہوں اپنی زندگی ہار گیا تھا۔۔۔۔۔ اُسے جھوٹے نام و ناموس کی بھیمنٹ چڑھا دیا گیا تھا۔۔۔۔۔ وہ ایک بار پھر پرانی پریتم بن گئی ہو گی لیکن اس دفعہ اُس نے کوٹھے میں پھلانگے تھے، دودھ نہیں پتے تھے۔۔۔۔۔ چار پائیاں نہیں اٹھاتی تھیں۔۔۔۔۔ اس نے قتل کئے تھے، نہایت دلیری اور سفاکی سے۔ اس نے اپنے شریر ذہن کو ایک اور انداز سے استعمال کیا تھا۔ اُس نے اپنے دشمنوں میں نفاق کا بیج بویا تھا۔ انیس کڑے ٹکڑے کیا تھا اور پھر چُن چُن کر مارا تھا۔۔۔۔۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ پھر یہی ہوتی سفاک قاتلہ لاکھے کے گھر موجود تھی۔۔۔۔۔ تمام حفاظتی انتظامات کے باوجود لاکھے اور اُس کے اہل خانہ کی زندگیاں سخت خطرے میں تھیں۔ میں اپنی ٹوپی نبھالتا ہوا تیزی سے اٹھا اور بلال شاہ کو ساتھ لے کر گھوڑوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

یہ وہ نہیں تھی

چار گھنٹے کا سفر قریباً ڈھائی گھنٹے میں طے کر کے ہم گاؤں واپس پہنچ گئے۔ لاکھے کا مکان گاؤں کی بیرونی حدود میں تھا۔ مکان کے دروازے کے پاس دو سپاہی ٹہل رہے تھے۔ بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ بھی مسلح سپاہی موجود تھے۔ باقی جوان شاید اندر صحن میں چار پائیاں ڈالے بیٹھے تھے مجھے دیکھتے ہی سپاہیوں نے بیٹھ کیا۔ سیوٹسکی آواز سن کر گوبندر سنگھ جلدی سے باہر آیا۔ بلال شاہ نے کہا۔

”کچھ اندر کا پتہ ہے آپ کو؟“

گوبندر نے اطمینان سے کہا سب ٹھیک ہے۔

”سب ٹھیک نہیں ہے“ میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ رات کے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اندر کی طرف قدم بڑھاتا ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ لیکن اس چیخ میں خوف یا درد کی بجائے ایک وحشت سی تھی۔ گوبندر منگھیر منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اسے سپاہیوں کے ساتھ تیتھے ہانے کا اشارہ کیا اور اندر گھستا چلا گیا۔ صحن خالی تھا۔ میں جھانکا تو مکان کے دوسری طرف گیا۔ تب اچانک اوپری منزل کی ایک کھڑکی دھماکے سے کھلی اور کسی شخص نے بڑی بدحواسی میں صحن میں پھلانگ لگا دی۔ وہ دھب کی زوردار آواز سے نیچے گرا۔ ایک لمحے کے لئے ساکت رہا، پھر اُس نے اٹھ کر جھلنے کی کوشش کی لیکن روکھڑا کر گر گیا کوئی میڑھیوں پر سے بھاگتا ہوا نیچے آیا۔ میں اُسے جسم سے فوراً پہچان گیا وہ پریم ہی تھی۔ اُس نے منہ پر شاید دوپٹے کا بھاتا باندھ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی چھری تھی۔ عین اُس لمحے زمین پر پڑا ہوا شخص مرنے لگا۔ ”بھاؤ... بھاؤ...“ وہ ہمیں دیکھ کر ایک کسے لئے ٹھٹھکی۔ اُس کے تیور خطرناک تھے۔ گوبندر منگھڑا آگے بڑھا لیکن اُس نے اتنے جنوا انداز میں چھری گھمائی کہ وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔

بلال شاہ کا ذہن ایسے موقعوں پر تیزی سے کام کیا کرتا تھا۔ اُس نے کہیں قریب سے ایک اینٹ پکڑی اور تاک کر اُس کے سر پر نشانہ مارا لیکن نشانہ خطا گیا۔ اینٹ اچلتی ہوئی اُس کے کندھے پر لگی۔ اُس نے ایک خوفناک چیخ ماری اور تیر کی طرح بلال کی طرف پکی۔ بلال شاہ گھبرا کر اٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا۔ صورت حال نہایت سنگین تھی۔ میں پستول نکال ہی رہا تھا کہ گوبندر منگھ نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے پیچھے

لڑایا۔ میں نے آگے بڑھ کر چھری اس کے ہاتھ سے پھین لی۔ ہاتھ پائی میں اُس کا ماما نکل چکا تھا۔ وہ پریم ہی تھی۔ لیکن یہ وہ پریم نہیں تھی جسے میں دو تین بار پہلے دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک بدلی ہوئی عورت تھی۔ اُس پر جنونی کیفیت طاری تھی۔ وہ نہایت تیار انداز میں چیخ رہی تھی اور بار بار گوبندر کو دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ کچھ فقرے سمجھ میں آتے تھے اور کچھ نہیں۔ انہوں نے میرا ہاتھ پھین لیا۔ انہوں نے اُسے آگ لگا دی۔ میں بھی انہیں آگ لگا دوں گی۔ ان کی آگ لگ کر دوں گی، گھر سے باہر گاؤں کے لوگ اکٹھے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے اسے ایس آئی گروڈت کو اشارہ کیا۔ اُس نے دو سپاہیوں کے ساتھ مل کر مشکل پریم کو ہتھکڑی لگائی۔ وہ اب زور زور سے رو رہی تھی۔ میں نے سامنے دیکھا لاکھانگھالی خالی گاروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اپنے گناہوں پر غور کر رہا تھا۔ میں نے گوبندر کو اشارہ کیا کہ لاٹھے اور اس کے بیٹے کو بھی ہتھکڑی لگا دو۔ زمین پر گرنے سے لاٹھے کے بیٹے کی ہانگ ٹوٹ گئی تھی۔

اس کیس میں لاٹھے اور اُس کے بیٹے کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ اُن پر یہ جرم ثابت ہو گیا کہ اُن نے چند ماہ پہلے ذاتی عداوت کی بنا پر ایک گھر کو آگ لگا دی تھی جس کی وجہ سے اٹھ افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ پریم کو سزائے موت سنائی گئی۔ اُس کے باپ نے اکلوتی بیٹی پر روپیہ پانی اور طرح بہایا۔ بائیکورٹ نے اس کی کم عمری کو مدنظر رکھتے ہوئے سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل دیا۔ میں نے سُننے کو اُس کا باپ جب بھی جیل میں اس سے ملنے گیا اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ ”اٹھ افراد“ کے وحشیانہ قتل میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ ایک مدت جیل کی صورت کو ترس رہا اور آخر جیل اور گھر کے درمیان دھکے کھاتا ہوا مر گیا۔

زیرینہ کے لئے

”رام پورہ“ کا نام ذہن میں آتے ہی ایک واردات کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے۔ اُن دنوں میں سب انسپکٹر تھا۔ ہوا یوں کہ رام پورہ کے قریب سے گزرنے والی نہر میں ایک عورت نے اپنے دو بچوں سمیت کوہِ گردِ کشتی کر لی۔ مجھے دنِ بارہ بجے کے قریب اس واقعے کی اطلاع ملی۔ سہ پہر کے وقت میں نے خود جائے حادثہ کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ جولائی اگست کے دن تھے۔ دھوپ میں کافی شدت تھی۔ میں اپنی گھوڑی پر سوار نہر کی طرف روانہ ہوا۔ گاؤں سے نہر تک کوئی تین چار فرلانگ لمبا ایک کچا راستہ جاتا تھا۔ جس وقت میں موقع پر پہنچا ٹوبے (دغوطہ خور) تھک مار کر پانی سے باہر نیٹھے ہوئے تھے۔

اُن کے گلے ہوئے چہرے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ لاشوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ نہر کے کنارے بہت سے بچے، بوڑھے، جوان جمع ہو گئے تھے۔ ایک طرف چند عورتیں اُٹی انداز میں زمین پر بیٹھی تھیں۔ اے ایس آئی نے مجھے ایک زمانہ مَوتا اور سرخ رنگ کے کپڑے کی ایک دھجی دکھائی۔ یہ کسی بچے کے فرائ کا ٹکڑا تھا۔ ان ہی دونوں اشیاء سے گاؤں والوں کو اندازہ ہوا تھا کہ ریشیاں نے اپنے بچوں سمیت نہر میں کوہِ گردِ کشتی

کر لی ہے۔ کسی نے اُسے چھلانگ لگاتے دیکھا نہیں تھا۔ صرف ایک کاشتکار نے اُسے بچوں کے ساتھ نہر کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ جبکہ نہر پر کپڑے دھونے کے لئے آنے والی دو عورتوں نے ریشماں کی جوتی اور کپڑے کی دھجی پہچانی تھی۔

ریشماں کا کوئی رشتہ دار اس گاؤں میں نہیں تھا۔ اس کا خاوند کام کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا تھا۔ بہر حال ریشماں کے اوس پڑوس کی کچھ عورتیں وہاں موجود تھیں۔ میں نے اُن سے چند سوال کئے۔ انہوں نے بتایا کہ ریشماں اور اس کے خاوند لطیف میرا چاچی بائی جاتی تھی۔ جن دنوں اُس کا خاوند گھر میں ہوتا تھا لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتا رہتی تھیں۔ جب میں نے عورتوں سے ریشماں کے چال چلن کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بیک زبان کہا کہ انہیں اُس میں کبھی کوئی بُرائی نظر نہیں آتی۔ ایک عورت بولی کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ لطیف اُسے کہیں سے نکال کر لایا ہے لیکن کچھ بھی تھا اب تو وہ بڑی مگر والی عورت نظر آتی تھی، اپنے بچوں پر جان چھڑکتی تھی اور خاوند کی خدمت گزار ہی میں۔ کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھی، پاس پڑوس کی کچھ عورتوں کا خیال تھا کہ اُن کی گھر بلیا چاڑھ کی وجہ اس کے خاوند کی تلخ کلامی تھی۔ شاید وہ نرمیہ اولاد کا خواہش مند تھا۔ لیکن بُد سے ریشماں کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اُس کے گھر تین بچے پیدا ہوئے تھے اور تینوں لڑکے تھیں۔ ایک لڑکی فوت ہو چکی تھی۔ مجموعی طور پر سب نے ریشماں کے کردار کی تعریف ان باتوں سے میرے خیال کی تصدیق ہوتی۔

ایک عورت کی جنازے

میں خود بھی کسی حد تک ریشماں کو جانتا تھا۔ ان کا گھر تھانے سے زیادہ دو

میں تھا۔ میں نے اُسے کئی بار تھانے کے سامنے سے گزرتے دیکھا تھا۔ سچی بات ہے کہ وہ ایک خوبصورت اور نہایت موزوں جسم کی مالک عورت تھی۔ میں ایک کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں۔ مجھے کبھی اس قسم کی باتوں سے دلچسپی نہیں رہی۔ یوں ہی لوگ پولیس والوں کی ہر حرکت کو دوسرے معنی پہنچاتے ہیں۔ بہر حال وہ ایک ایسی عورت تھی جس پر نظر پڑنے کے بعد فوراً واپس نہیں آتی۔ میں نے اُسے کئی بار اپلوں کا ڈھیر سر پر رکھے گلی میں گزرتے دیکھا تھا۔ کبھی اُپلوں کی جگہ پانی کا گھڑا ہوتا تھا۔ ایک بی اُس نے کوئلے سے چٹائی ہوئی تھی اور دوسری کو اُنگلی سے لگا رکھا ہوتا تھا۔ کوئلے سے چٹتی ہوئی بچی کبھی تو اُنگھوٹا چوستی نظر آتی اور کبھی اُس کا ننھا منا ہاتھ ماں کے سینے پر گردش کرتا دکھائی دیتا۔ گاؤں کی زندگی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ زندہ رہنے کے لئے ایام و کیا عورتیں سب کو سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ گاؤں کی لڑکیاں شادی کے دو تین سال بعد ہی بڑھاپے کی طرف گامزن ہو جاتی ہیں۔ دو بچیوں کی ماں کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ کبھی اس عورت پر بھی جوانی آئی تھی۔۔۔۔۔ ہاں تو میں ریشماں کا ذکر کر رہا تھا۔ اگر یہ سیلی کھلی عورت کہیں شہر میں ہوتی تو اس کے انداز ہی اور ہوتے۔

میں نے اپنے سامنے تیزی سے بہتی ہوئی نہر کو دیکھا۔ بارشوں کا موسم تھا اور ہاؤس کافی شدت محسوس ہو رہی تھی۔ اب یہاں سے لاشوں کا لینا ایک مشکل امر تھا۔ میں نے اپنے حرر کو ایک سپاہی کے ساتھ فوراً کبیر والا ہیڈ ورکس کی طرف بھج دیا۔ وہاں کا انچارج مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ لاشوں کی دستیابی کے لئے پورا تعاون کرے گا۔

کے بعد اُسے جالندھر ہسپتال مارٹم کے لئے روانہ کر دیا گیا۔

میں نے سوچا

لطیف یا ریشماں کے رشتے داروں کو یا تو حادثوں کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی یا وہ جانی بوجھ کر رام پورہ نہیں پہنچتے تھے۔ لطیف کے صرف ایک چچانے اُس کی بیوی اور بچوں کی تجہیز و تکفین میں شرکت کی تھی۔ اتفاق سے وہ ابھی گاؤں ہی میں تھا۔ میں نے اُسے تھانے بلایا اور کہا کہ وہ لطیف کے لواحقین سے رابطہ قائم کرے۔ اُس نے بتایا کہ لطیف کا باپ اور اس کے بھائی اس کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔ وہ اس کے پتوں کی موت پر نہیں آتے، وہ اب بھی نہیں آئیں گے۔ اُس نے بتایا کہ وہ ریشماں کے میکے کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا لیکن اُسے اتنا یقین تھا کہ انہوں نے اپنی بیٹی کے ساتھ مرنا جینا ختم کر رکھا ہے۔

تھانہ بھی ایک مصیبتوں کا گھر ہوتا ہے۔ ہر وقت چوری، ڈکیتی، قتل کی وارداتوں کا ذکر جہاں ہر روز کوئی نیا پھٹا کھڑا ہو جاتے وہاں پُرانے پھٹے کم ہی یاد رہتے ہیں۔ شاید خودکشی کی یہ المناک واردات بھی آئی گئی بات ہو جاتی لیکن ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کبیر والا ”سیفین“ کا انچارج علی احمد ا ایک روز تھانے آیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کچھ روز سے اُس کے ذہن میں ایک شک پرورش پا رہا ہے۔ وہ کچھ الجھا الجھا سا نظر آ رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ حادثے کے روز محزر کے پہنچنے پر انہوں نے نہر میں جال لگایا تھا۔ جال لگاتے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر تینوں لاشیں برآمد ہو گئی تھیں۔ اسے الجھن اس بات

دوسرے روز صبح مجھے جو پہلی خبر ملی وہ یہی تھی کہ تینوں لاشوں کو کبیر والا ”سیفین“ سے نکال لیا گیا ہے۔ یہ ایک سیدھا سا داغودکشی کا کیس تھا۔ گھر لوٹنا چاہتی تے تنگ آکر ایک عورت نے خودکشی کر لی تھی۔ بہر حال کاغذی کارروائی ضروری تھی۔ میں نے نمبردار کے علاوہ گاؤں کے چند معزز افراد اور اہل محلہ کے بیان طلبہ کئے۔ ریشماں کا خاوند بھی آچکا تھا۔ وہ اٹھائیس اسیس سال کا ایک خوش شکل آدمی تھا۔ لیکن اس وقت اُس کی حالت نہایت تپتی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح خالی خالی لگا ہوں سے ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ کبھی بیٹھے بیٹھے اچانک مٹہ پھپکا کر رونے لگتا تھا۔ شاید اُسے سمجھنا دے کی آگ جلا رہی تھی۔ میں نے اُس سے چند سوالات کئے۔ لیکن وہ کوئی ٹھکانے کا جواب نہ دے سکا۔ وہ بار بار اپنی بچیوں کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ اُس کی ایک پڑوسن نے روتے ہوئے بتایا۔

”میں نے اس ماں مارے کو کئی بار سمجھایا کہ ریشماں سے اتنی تلخی سے نہ بولا کر، وہ بات دل کو لگا لینے والی لڑکی ہے لیکن یہ تو پورا پورا خاوند بننے پر تلا ہوا تھا۔ جب بھی گھر آتا تھا اُسے رُلا کر جاتا تھا۔

شام کو ایک ساتھ جب تین جنازے اُٹھے تو گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ تینوں ماں بیٹیوں کی موت پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ جنازے میں شرکت کے بعد میں ایک ضروری کیس کے سلسلے میں سبقت وائے گاؤں چلا گیا۔ واپس آکر میں نے ابھی رات کا کھانا کھایا ہی تھا کہ ایک اور خبر ملی۔ ریشماں کے خاوند نے ”پٹرٹری پر سر رکھ کر خودکشی کر لی تھی۔ یہ خبر سنتے ہی میری آنکھوں میں اس کا غمناک چہرہ گھوم گیا۔ میں نے اُسے ایس آئی ملہوڑا کو موقع پر روانہ کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد لاش تھانے میں آگئی۔ ضروری کارروائی

بہر حال اب صورتحال مختلف ہو چکی تھی۔ تمام واقعات کو نئے سرے سے دیکھنا تھا۔ علی احمد اور میں کافی دیر گفتگو کرتے رہے پھر اُس نے اجازت چاہی۔ میں نے تعاون کا شکریہ ادا کر کے اُسے رخصت کر دیا۔

میں نے تنہائی میں سوچنا شروع کیا۔ بالفرض ریشماں اور اُس کے بچوں کو قتل کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ قاتل کی غرض کیا تھی۔ کوئی زمینی تنازعہ تھا، کوئی خاندانی رنج تھی یا..... یا اس کے خاندان نے ہی اُسے قتل کر دیا تھا۔ آخری بات کسی صورت دل کو نہیں لگتی تھی۔ ٹھیک ہے میاں بیوی میں چپقلش رہتی تھی لیکن چھوٹی موٹی چپقلش کس گھر میں نہیں ہوتی۔ پھر تو عمر سے پیشتر اُن کے درمیان کوئی سنگین نوعیت کا جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے تھلنے میں اُس کے خاندان کی حالت دیکھی تھی۔ اس کے چہرے پر رنج و الم کے سلتے بناوٹی نہیں تھے۔ وہ بار بار اپنی بچوں کا نام لے کر پکار رہا تھا شاید اس کا خیال تھا کہ ریشماں نے اُس کے رویتے سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی ہے۔ بظاہر اُس کی اپنی خودکشی کی بھی یہی وجہ نظر آتی تھی۔ اُس کے اس اقدام کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے بال بچوں کو دل کی گریباؤں سے چاہتا تھا۔ باقی یہی خاندانی رنجش والی بات تو اس پر غور کیا جاسکتا تھا۔ لطیف کے چچانے واضح طور پر کہا تھا کہ ریشماں اور لطیف کی شادی اُن کی باہمی محبت کا نتیجہ تھی اور اس شادی نے دونوں کو اپنے اپنے رشتہ داروں سے بالکل کاٹ دیا تھا۔ ہو سکتا تھا یہ ان دونوں میں سے کسی کے قریبی رشتہ داروں کا کام ہو۔ لڑکی کے گھر والوں پر زیادہ شک کیا جاسکتا تھا۔ اس قسم کے معاملوں میں لڑکی والوں کا عموماً زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ بہر حال لڑکے والوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لطیف کے چچا کی باتوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ

کی تھی کہ ماں کی لاش بچپن کی لاش سے کوئی پانچ منٹ قبل جال میں آگئی تھی۔ علی احمد خاں کا پورا کا پورا خاندان پولیس کے محکمے سے وابستہ تھا۔ اپنے بھائیوں میں بھی صرف وہی اکیلا تھا۔ جس نے پولیس کے علاوہ کسی اور محکمے میں ملازمت کی تھی۔ اُس کی فطرت میں تجسس اور باریک بینی کا پایا جانا ایک قدرتی امر تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اُسے شک ہے یکنیس خودکشی کا نہیں۔ اب میں نے اُس کی بات پر غور کیا تو بے ساختہ اس کی ذہانت کی دوا دینے کو دل چاہا۔ واقعی سوچنے کی بات تھی۔ ماں کی لاش دونوں بچوں سے پہلے کیوں پہنچی۔ پانی کا ہوا بہت تیز تھا، کہیں کوئی رکاوٹ وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اس بات کا امکان بھی نہیں تھا کہ دونوں بچوں کی لاشیں ایک ساتھ کہیں پر اکٹ گی گئی ہوں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی وارداتوں میں ماں عموماً پہلے اپنے بچوں کو پانی کے پُور کر دیتی ہے۔

جیران کُن بات تھی کہ نسبتاً بھاری بھر کم ہونے کے باوجود ماں کی لاش بچوں سے پہلے جال میں کیونکر پہنچ گئی؟ پھر مجھے واردات کے روز کا ایک واقعہ یاد آیا۔ اس واقعے پر میں پہلے بھی غور کر چکا تھا لیکن اُس وقت میری سوچ کا انداز مختلف تھا۔ میرے ایک سپاہی نے جو ذرا عاشق مزاج تھا اور عموماً عورتوں کے چکر میں رہتا تھا، مجھے بڑے رازدارانہ طریقے سے بتایا کہ اُس روز دس گیارہ بجے کے قریب وہ بڑی خوش و خرم تھلنے کے قریب سے گزری تھی۔ وہ شاید دونوں بچوں کو کنویں سے نہلا کر لا رہی تھی۔ میں اس وقت ایک آدمی سے گفتگو میں مصروف تھا اُس کی صرف ایک جھلک میں نے دیکھی تھی۔ یہ جھلک کئی بار میرے ذہن میں تازہ ہوتی تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اُسی عورت کی جھلک تھی جس نے صرف ایک گھنٹے بعد بچوں سمیت موت کو گلے لگا لیا تھا۔

حدود میں واقع تھا۔ گرمیوں کی طویل دوپہر ہم نے کچے راستے پر دھول اڑاتے گزار دی گھوڑوں پر سوار جب ہم تھکے ہمارے منزل مقصود پر پہنچے تو دھوپ بھی دھلنی شروع ہو گئی۔ یہاں کا سگھہ تھانیدار بڑا ملنسار اور خوش اخلاق آدمی تھا۔ اسے پہلوانی کا زبردست شوق تھا۔ یوں بھی وہ ایک شہہ زور شخص تھا۔ میلوں ٹھیلوں میں ہونے والی کشیتوں میں بڑی باقاعدگی سے شرکت کرتا تھا۔ ہم اُسے مارا پہلوان کے نام سے یاد کرتے تھے۔ تارے نے تھلے میں میری خوب آؤ بھگت کی۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد میں نے اُنے کا مقصد بیان کیا۔ لطیف کے بڑے بھائی فاسو کا نام سن کر وہ چونک گیا۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ فاسو پر مجھے فلاں نوعیت کا شک ہے تو اُس نے دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ قتل کی واردات میں فاسو کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔

میں نے پوچھا کہ وہ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتا ہے۔ ٹھیک ہے وہ اُس کے تھانے کا راتشی تھا لیکن پولیس والے کا تو کام ہی ہر شخص پر شک کرنا ہوتا ہے۔ میری بات سن کر وہ مسکرا دیا۔ اُس نے کہا۔

”فواز خاں! فاسو کو جتنا میں جانتا ہوں شاید اس کے ماں باپ بھی نہیں جانتے۔ یہ اُستاد فاسو ہی ہے جس نے مجھے پہلوانی کا شوق دلایا اور اکھاڑے کے داؤ بیچ سکائے۔ وہ ایک زبردست پہلوان ہے۔ پہلوانی کے سوا نہ اُسے کچھ آتا ہے اور نہ ہی اُسے کسی چیز میں دلچسپی ہے۔ وہ تو بڑا زار آدمی ہے وہ کسی عورت کو قتل کیوں کرنے لگا۔“

”میں نے اُسے بتایا کہ مجھے تو اس کے بارے میں بالکل مختلف رپورٹ ملی ہے۔ سنا ہے وہ نہایت خطرناک شخص ہے۔ کئی افراد کے ہاتھ پاؤں تو پچکا ہے۔“ تارے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ”بات تو تمہیں کسی نے ٹھیک بتائی ہے۔“

لطیف کے بھائی اُس کے جانی دشمن تھے۔ لطیف کے لڑکی نکال کر لے جانے کی وجہ سے ساری برادری میں اُن کی ناک کٹ گئی تھی۔ اس وجہ سے اُن کی ایک بہن کی منگنی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ لطیف کا بڑا بھائی جو بہت سخت مزاج اور غصیلہ شخص تھا ایک دفعہ ”رام پورہ“ آکر اُس سے ہاتھ پائی بھی کر چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ لوگ لطیف سے زیادہ ریشماں سے عداوت رکھتے ہوں۔ انہوں نے موقع دیکھ کر اُسے پتھری سمیت ٹھکانے لگا دیا ہو۔

لطیف کے گھر والوں سے رابطے کا واحد ذریعہ اُس کا چچا تھا۔ اُس کا نام شاید رحمت تھا۔ میں نے اگلے روز دو سپاہی اُس کے گاؤں بھیجے۔ سہ پہر کے وقت وہ تھانے حاضر ہو گیا۔ اس دفعہ میں نے کڑید کرید کر اس سے لطیف کے گھر والوں کے متعلق کچھ اور سوال پوچھے۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ لطیف کا بڑا بھائی فاسو ایک خطرناک شخص تھا۔ کئی لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑ چکا تھا۔ اس کے ماضی کو دیکھتے ہوئے شبہ کیا جاسکتا تھا کہ اُس نے بھائیوں کے ساتھ بل کر بھانج کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔ رحمت کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ خود بھی اپنی برادری سے کٹا ہوا ہے۔ اُس نے بھی لطیف کی طرح اپنی مرضی سے شادی نہ چاہی تھی اور سب سے الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی جو اُس نے لطیف کے گھر والوں کے متعلق مجھے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا تھا۔

بیرجی بھی ٹپک پڑے

دوسرے روز میں نے اسے ایس آئی ملہو ترا اور چند سپاہیوں کے ساتھ لطیف کے پیلے گاؤں کا رخ کیا۔ یہ گاؤں دس بارہ کوس کے فاصلے پر ایک دوسرے تھانے کی

لیکن قاسم خطرناک صرف اکھاڑے میں ہوتا ہے اور ہاتھ پاؤں بھی اُس نے پہلوانوں کے ہی توڑے ہیں۔ دو دفعہ تو میرا کندھا اُترا ہے اس کے ہاتھوں میں اُس کی حمایت میں اس نے نہیں بول رہا کہ وہ میرا استاد ہے۔ تفتیش کے بعد بھی تمہیں آخر اسی نتیجے پر پہنچنا ہے۔۔۔۔۔ دراصل تمہیں صحیح اطلاع نہیں دی گئی۔“

بہر حال میرے کہنے پر اُس نے آدھ گھنٹے کے اندر اندر قاسم اُس کے باپ اور بھائیوں کو تھانے میں بلا لیا۔ قاسم کا چہرہ واقعی کسی قاتل کا چہرہ نہیں تھا۔ اس کی عمر پچیس سال کے قریب تھی۔ لیکن صحت بہت اچھی تھی۔ گفتگو سے وہ ایک سیدھا سادا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ دونوں چھوٹے بھائی بھی چہرے مہرے سے شریف ہی نظر آتے تھے۔ اُن کا باپ سُرخ و سپید چہرے والا ایک باریش شخص تھا۔ اُس کے ماتھے کی محراب اُسے ایک مذہبی شخص ظاہر کرتی تھی۔ بیٹے اور اُس کے بچوں کی ناگمانی موت پر وہ ہلول ضرور تھا لیکن اپنے رویے پریشیاں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”تھانیدار جی، جو خدا اور اُس کے رسول کا دشمن وہ ہمارا دشمن۔ لطیف میرے اور میرے گھر والوں کے لئے اُسی وقت مر گیا تھا جب پانچ سال پہلے اُس نے مرضی سے شادی رچائی تھی۔ ہمارا جینا مرنا ختم ہو چکا تھا۔“

میں نے کہا ”بزرگو! تم یہ بات اپنے متعلق تو کہہ سکتے ہو لیکن اپنے گھر والوں کے متعلق نہیں کہہ سکتے۔“

قاسم شاید میرا اشارہ سمجھ گیا تھا، کہنے لگا ”تھانیدار جی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ چند ماہ پہلے میں لطیف سے ملنے کے لئے رام پورہ گیا تھا۔ چھوٹے بھائی کی محبت مجھے کھینچ کر وہاں لے گئی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں غلطی پر تھا۔ دراصل اُن دنوں

میں پہلی بار بیچلا تھا کہ وہ رام پورے میں رہتا ہے اور اُس کے دو بچے بھی ہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ خبر اُس کے سسرال بھی جا پہنچے گی۔ جب اُن لوگوں کو پتہ چلے گا کہ اُن کی لڑکی کو بھگالے جانے والا فلاں جگہ رہتا ہے تو وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ اُسے یا اُس کے بچوں کو نقصان پہنچائیں۔ میں نے ضروری سمجھا کہ لطیف سے مل کر اس خطرے سے آگاہ کروں اور جگہ منتقل ہونے کا مشورہ دوں۔ میں نے اُس سے مل کر اُسے بڑی نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن وہ میری ہر بات کا اُلٹا مطلب لیتا رہا۔ اُس نے بڑے طیش سے کہا میں یہیں رہوں گا اور ٹھونک بجا کر رہوں گا، تم سے اور تمہارے باپ سے جو کچھ ہوتا ہے وہ کر لو۔ اُس کا خیال تھا کہ میرے اُس کے پاس آنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ دونوں بیاں بیوی میں علیحدگی ہو جائے۔ اُس کی اُلٹی باتوں پر مجھے بھی طیش آگیا۔ میں نے اُسے پھینٹ مارا اور وہ مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ مجھے اُس سے یہ اُمید نہیں تھی۔۔۔۔۔ میں روتا ہوا دہاں سے واپس آیا۔

قاسم پہلوان کی آنکھوں میں پھیرا آسو چمک رہے تھے۔ اُس کے باپ نے زنت لہجے میں کہا۔

”وہ تھا ہی بڑا بد فطرت، کوئی اچھائی کرتا تھا تو اُسے بھی بُرائی سمجھتا تھا۔ یہ جو لکھ ہوا ہے سب اُس کے کرموں کا پھل ہے۔“

میں نے اُن سے پوچھا ”آپ لوگوں کو کس پر شک ہے؟“

اُس کے باپ نے کہا ”ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ہمیں کسی پر شک کرنے کی ضرورت ہے۔“

مجھے اُس کے باپ کی بے حسی پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے ذرا تھانیداری لہجے میں کہا ”بزرگوار! یہ بات نہ کرو۔ تعلق تو تم سب کا بنتا ہے۔ وہ تمہارا بیٹا تھا۔ تمہارے بیٹے کو تم سے ایک عورت نے چھین لیا۔ وہی عورت اپنے بچوں سمیت قتل کر دی گئی۔ تعلق کیسے نہ بناتا تھا؟ اب اگر تم لوگ مجھے کچھ بتاؤ گے نہیں تو بات کیسے بنے گی؟“
 تاسو میرے لہجے کی گری محسوس کر کے بولا ”تھانیدار صاحب شک والی تو کوئی بات ہی نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر لطیف کے بیوی بچے قتل ہو رہے ہیں تو اس کے سسرال والوں نے کئے ہیں۔“

میں نے پوچھا ”خاص طور پر تمہیں کس پر شک ہے؟“

تاسو نے کہا کسی ایک پر شک تو ہم نہیں کر سکتے۔ بہر حال ریشماں کے دو بڑے بھائی خاص طور پر اصرار ہیں۔ پہلے پہل انہوں نے ہمیں بھی بہت دھمکیاں دیں تھیں لیکن اب سال ڈیڑھ سال سے خاموش ہیں۔

تاسو کے ایک بھائی نے کہا ”تھانیدار جی! آپ کو ان کے گھر کے اندرونی حالات کے بارے میں ٹھیک ٹھیک باتیں عبداللہ ہی بتا سکتا ہے۔ سنا ہے یہ شخص پیری مریدی کرتا ہے۔ ریشماں کے گھر والے اس کے زبردست مرید ہیں۔ ہر کام کرنے سے پہلے وہ اُس سے مشورہ لیتے ہیں۔ یہ شخص ”ہندی پور“ میں رہتا ہے۔“

”ہندی پور میرے ہی تھانے کا ایک موضع تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا لیکن عبداللہ نامی کسی پیر فقیر کا چہرہ ذہن میں نہیں آیا۔ رخصت ہونے سے قبل میں نے لطیف کے گھر والوں اور خاص طور پر اُس کے والد سے کہا کہ مرنے والا مر گیا۔ اب وہ قاتلوں کو کفر کر دار تک پہنچانے کے لئے پوری ایما نڈاری کے ساتھ پولیس سے تعاون کریں

لیں ان کی پوری حفاظت کرے گی۔ میں نے تارا سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ کہیں کھویا ہوا اپنے بازوؤں کے مسلسل ٹٹول رہا تھا۔ چونک کر بولا ”بالکل بالکل۔ یہ بھی کوئی کینے کی بات ہے بادشاہو۔“

سنہرے بالوں والی لڑکی

اس سے اگلے روز میں نے ملہوڑا کو ایک سپاہی دے کر ہندی پور بھیجا۔ وہ ڈیڑھ سال بعد عبداللہ کو تھانے لے آیا۔ میری توقع کے برعکس وہ تیس تیس سال کا ایک جوان نہ تھا۔ داڑھی مٹو کچھ بالکل صاف تھی۔ پہلے تو مجھے شک ہوا شاید ملہوڑا کسی اور شخص پر پڑ لیا ہے لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی پیری مریدی والا عبداللہ ہے۔ عبداللہ انہیں سُرخي مائل اور چمکدار تھیں۔ پہلی نظر میں ہی وہ مجھے ایک چالاک اور گمراہ شخص لگائی دیا۔ بہر حال اس وقت وہ کچھ ڈرا ڈرا سا تھا۔ میں نے پہلے تو اس کا رہا سہا مادہ دودھ کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ کافی سے زیادہ ڈر چکا تو میں نے اُس سے ان کے گھر والوں کے بارے پوچھ گچھ شروع کی۔ وہ تھوڑا سا جھکا۔ میں نے سر دھسایا۔

”دیکھ میاں۔ میں دم در دودھ کا منکر نہیں ہوں لیکن میرے پاس جو جوت ہے وہ ایک بار چٹ گیا تو سارے دھنیے دھرے رہ جاتیں گے۔ اگر تیس سال جیل کاٹنے کا ارادہ تو خوشی سے چُپ رہو ورنہ سب کچھ صاف صاف کہہ دو۔“

”اس نے اٹھک اٹھک کر جو باتیں بتائیں ان کا لب لباب یہ ہے، ریشماں کے ایک رب نواز کے دونوں بڑے بیٹے باہر چھ مہینے سے ایک مقدمہ میں جلا

بھگت رہے ہیں۔ چھوٹا بیٹا گھر میں ہے لیکن وہ بیساکھیوں کے سارے چلتا ہے۔ اُس سے یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ اُس نے تھرے قتل کی واردات کی ہو۔ رب نواز خود کافی بوڑھا ہو چکا ہے اور یوں بھی بیمار ہوتا ہے۔

عبداللہ کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ رب نواز اور اس کے بیٹوں کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر اُسے آنکھیں دکھائیں تو اُس نے کہا۔

”تھانیدار صاحب! اگر رب نواز کے دونوں بیٹے جیل میں نہ ہوتے تو میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ واردات میں اُن کا ہاتھ ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ پچھلے دنوں انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ لطیفؒ رام پورے میں رہتا ہے۔ انہوں نے جیل سے رہا ہوتے ہی اس کا کام تمام کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ میں نے سخت لمبے میں کہا ”اس کا مطلب ہے تمہیں اس منصوبے کا علم تھا پھر بھی تم نے پولیس کو اطلاع نہیں دی۔ کیا میں تمہیں بھی اُن کا ساتھی سمجھوں۔“

”جی۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ جی“ وہ بُری طرح گڑبڑا گیا اور بیگناہی کی قمیص کھلنے لگا۔ میری نظروں میں اُس کا کردار کچھ مشکوک ہو گیا تھا۔ بہر حال میں نے اس شرط کے ساتھ اُسے جانے کی اجازت دے دی کہ وہ کبھی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائے گا اور اطلاع دیتے بغیر تھانے کی حد دوسے باہر نہیں جائے گا۔

وہ اُٹھ کر گیا ہی تھا کہ لطیف کا چچا رحمت آگیا۔ میں نے اُسے خود تھانے بلوایا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ رحمت کا اس قتل میں کوئی ہاتھ ہو۔ جھاتور کے ساتھ اُس کی دشمنی اس کی غلط بیانی سے ظاہر ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنے

بچوں کا سو پہلوں وغیرہ کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ اس سے بالکل مختلف نکلے تھے۔ لطیف کی طرح وہ بھی خاندان برادری سے کٹا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے اُس نے بھائی کی دشمنی بھتیجے سے لی ہو۔ بھتیجے کا گھر برباد کر کے اُسے والدین سے لڑانے کی کوشش کی ہو۔ میں نے اس سے چند سوالات کئے۔ اُس کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ لطیف کے گھر صرف دو تین دفعہ آیا تھا۔ ہاں لطیف اور ریشماں اُس کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔

میں نے اُس سے کہا ”ریشماں! واردات کے روز اپنے بچوں کو مندا دھلا کر کہیں روانہ ہوتی تھی۔ اُس نے پڑوس کی عورت سے کہا تھا کہ وہ کل آئے گی۔ تمہارے گھر کے علاوہ وہ کہیں آتی جاتی بھی نہیں تھی۔ تمہارا کیا خیال ہے وہ تمہارے ہاں آ رہی تھی؟“ رحمت نے کہا ”وہ صرف ایک ہفتہ پہلے تمہارے ہاں آتی تھی اور پھر جس راتے پردہ جا رہی تھی وہ تمہارے گاؤں کو نہیں جاتا۔ میرا خیال ہے وہ کہیں اور جا رہی تھی۔“

تھوڑی دیر کے بعد میں نے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے ایک نمبر اُس کے پیچھے لگا دیا۔ میں نے اس بات پر غور شروع کیا کہ ریشماں واردات کے روز کہاں جا رہی تھی؟ مجھے اندازہ ہوا کہ ریشماں کے سلسلے میں میری معلومات ابھی کافی محدود ہیں۔ میں نے اس کے پڑوس کی دو عورتوں کو پھر تھانے بلوایا اور نئے سرے سے پوچھ گچھ کی۔ دونوں عورتوں نے بتایا کہ ریشماں مینے میں ایک آدھ بار اپنے کسی چچا سے ملنے جایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ میرے اس سوال پر کہ اُس کے گھر کون کون آتا تھا۔ ایک عورت کچھ یاد کرتے ہوئے بولی ”مجھے کی عورتوں کے علاوہ صرف ایک نوجوان لڑکی کبھی کبھی اُس سے ملنے آتی تھی۔ یہ ایک اہم اطلاع۔“

سے معذوری ظاہر کی یا شاید پریشانی کی وجہ سے اُنہیں یاد نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سنہری بالوں والی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اور ساتھ والے گاؤں سے آتی تھی۔ میں نے پوچھا کیا وہ خاص طور پر صرف ریشماں ہی سے ملنے آتی تھی۔ ایک عورت کو کچھ یاد آ رہا تھا۔ اُس نے کہا ”تھانیدل پترا“ مجھے یاد آ رہا ہے ریشماں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ.... ہاں زربینہ نام تھا اُس کا.... ریشماں نے کہا تھا کہ زربینہ اپنی پھوپھی سے ملنے آتی ہے۔ ایک دفعہ تو مجھے اس پر شک بھی ہوا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اُس کی پھوپھی اراپیوں کے محلے میں رہتی ہے۔ لیکن میں نے کبھی اس کی پھوپھی کو اُس کے ساتھ نہیں دیکھا۔ نہ ہی اُس نے کبھی ریشماں کو اپنی پھوپھی سے ملایا۔

عبداللہ مشکوک تھا!

وہ لڑکی کون تھی جو ریشماں سے ملتی تھی۔ میں نے اپنے مخبروں کو اراپیوں کے محلے میں چھان بین کرنے کو کہا۔ لیکن زربینہ اس کی پھوپھی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس کا مطلب تھا زربینہ نامی یہ لڑکی مشکوک تھی۔ پڑوس کی عورتوں کے مطابق خودکشی کے واقعے سے دو روز قبل بھی وہ لڑکی ریشماں کے گھر آتی تھی۔ ہو سکتا تھا اس لڑکی کی ریشماں کے ہاں آمد و رفت کا قتل سے گہرا تعلق ہو لیکن اس لڑکی کا پتہ کیسے چلایا جائے۔ کچھ معلوم نہیں تھا وہ کون تھی؟ کہاں سے آتی تھی۔ اگر واقعی اُس کا قتل میں ہاتھ تھا تو اُس کے دوبارہ یہاں آنے کی توقع نہیں تھی۔ بہر حال میں نے پڑوس کی عورتوں اور اپنے مخبروں کو اس بارے میں خبردار کر دیا۔

تمام راستے ایک مقام تک پہنچ کر ختم ہو گئے تھے۔ ریشماں کے باپ سے بھی

ملاقات ہو چکی تھی۔ اُس کے دونوں بیٹے واقعی جیل میں تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ اب آگے بڑھنے کے لئے کسی مخبر کی حوصلہ افزا رپورٹ ملنا ضروری تھی۔ تقریباً دو ہفتے گزر گئے لیکن کسی قسم کی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ ایک موقع پر تو مجھے بھی شک ہونے لگا کہ شاید یہ خودکشی کا ہی کیس ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ سے ماں کی لاش بچپن سے پہلے ”سینفن“ پر پہنچ گئی ہو.... لیکن پھر مجھے واردات کے روز ریشماں کی جھلک یاد آئی جو میرے محلے کے سپاہی نے مجھے دکھائی تھی۔ اور میں سوچتا کہ وہ بڑے ناز سے اپنے دھلے ہوئے بالوں کو شانوں پر پھیلائے بچوں کے ساتھ لگی سے گزری تھی۔ کیا وہ خودکشی کرنے جا رہی تھی؟ نہیں۔ یہ بعید از قیاس ہے.... اور پھر سنہری بالوں والی وہ نامعلوم لڑکی پیچھے ہٹنا اب اتنا آسان نہیں تھا۔ ٹھیک ہے اس کیس کی پیروی کوئی نہیں کر رہا تھا لیکن شاید.... میں خود اس کی پیروی کر رہا تھا۔

بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ جب آدمی کسی کام کو کرنے کا عزم کر لے تو راستے خود بخود ہلکے چلے جاتے ہیں۔ خدا کو وہ لمحہ بہت پیارا ہوتا ہے جب کسی بندے کی ہمت ٹوٹ کر پھر بندھتی ہے.... میں نے کیس کی فائل نکالی اور اُسے نئے سرے سے کھنگالنے لگا۔ تب اچانک قدموں کی آواز آتی میں نے سر اٹھایا تو قاسم پھولان میرے سامنے تھا۔ آؤ پھولان میں نے اس سے مصافحہ کر کے گڑسی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ بہت دیر اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک نیک فطرت انسان ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی کی ہزار غامیوں کے باوجود اُسے اُس سے محبت تھی۔ اس وقت بھی وہ اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے آیا تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے عبداللہ کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ بڑا فرتی آدمی ہے۔ اُس کی پیری فیری سب ڈھونگ ہے۔ ایک دفعہ اس نے ایک کمن لڑکی کو چن نکلانے کے

بہانے کمرے میں بند کر لیا۔ بعد میں لڑکی نے والدین سے شکایت کی کہ پیر صاحب نے کپڑے اتارنے کو کہتے تھے۔ ریشماں کے گھروالوں کو اس میں خجائے کیا نظر آتا ہے ورنہ اس کے اپنے گاؤں والے بھی اُسے منہ نہیں لگاتے۔ اُس کی باتوں سے بھی پتہ چلا کہ عبداللہ پوست کا نشہ کرتا ہے۔ پوست کے ذکر پر میں چونک گیا۔ مقدمے کی فائل میرے سامنے ہی پڑی تھی۔ میں نے لطیف کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نکالی۔ کیمیکل ایگزامینر کے مطابق متوفی کے معدے میں پوست کے اجزاء پائے جاتے تھے۔ دوسرے نشوں کی نسبت پوست کا استعمال اتنا عام نہیں کیا جاتا۔ اس اتفاق نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ عبداللہ جو پہلے ہی میری نظروں میں مشکوک تھا اب اور مشکوک ہو گیا تھا۔

میں نے اگلے روز پہلا کام یہ کیا کہ ”مہندی پور“ کے ایک خاص مخبر کو عبداللہ کی نگرانی پر لگا دیا۔ مخبر نے تیسرے ہی روز ایک چونکا دینے والی خبر سنائی۔ اُس نے بتایا کہ سسرے بالوں والی ایک لڑکی عبداللہ سے ملنے اس کے ڈیرے پر آتی ہے۔ کل شام بھی وہ اس سے ملنے آئی تھی۔ دونوں نے کوئی دو گھنٹے تنہائی میں گزارے لگتا ہے کہ اُن دونوں میں پیری مریدی کے علاوہ بھی کوئی رشتہ ہے۔ یہ بہت اہم خبر تھی۔ میں نے مخبر کو شاباش دے کر واپس بھیجا۔ اور اُسے کہا کہ احتیاط سے نگرانی کا کام جاری رکھتے۔ مسئلہ کچھ الجھ رہا تھا لیکن یہ بڑی بات تھی کہ سنری بالوں والی لڑکی کا کاکھوج کھرا مل گیا تھا۔ ریشماں کے والدین اور عبداللہ کا رابطہ تو سمجھ میں آتا تھا۔ لیکن یہ سنری بالوں والی لڑکی کون تھی۔ یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ اس واردات میں اس لڑکی کا کردار کس نوعیت کا تھا؟ دوسروں میں ہو سکتی تھیں، عبداللہ نے اس لڑکی سے کام لیا تھا یا وہ عبداللہ سے کام لے رہی تھی۔۔۔۔۔ اگر وہ اس سے کام لے رہی

ی تو کیوں؟ اُسے ریشماں کے قتل سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ وہ لطیف سے مادی کرنا چاہتی تھی۔ اس سے کوئی انتقام لے رہی تھی؟ کس چیز کا انتقام؟ اُس روز کافی گرمی پڑ رہی تھی۔ میں ایک چھوٹے سے ہوٹل کے اندر کرسی پر بیٹھا ہا۔ سامنے بسوں کے اڈے پر پولیس کے چھ جوان سادہ کپڑوں میں گھوم رہے تھے مخبر کی اطلاع کے عین مطابق زمین بس اڈے پر پہنچ چکی تھی۔ اُس نے بوسکی رنگ کی ایک بسی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ایک بڑا صندوق اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ وہ بے چینی سے ٹانگوں کے اسٹینڈ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بائیس تیس سال کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ دھوپ کی وجہ سے اس کا رنگ بالکل سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ بسوں کے کنڈکٹر اور ڈرائیور اُسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے شاید اسی لئے وہ کچھ گھبراتی ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ بار بار چادر کے پتے سے پیرہ ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب ایک ٹانگے سے عبداللہ اترتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ وہ تیز قدم اٹھاتا سیدھا زینہ کے پاس پہنچا۔ دونوں تھوڑی دیر کھسکھس کر کتے رہے۔ پھر عبداللہ نے ٹکیٹیں لیں اور وہ دونوں چند ہی گڑھ جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔ یہ بس اُس ہوٹل کے عین سامنے کھڑی تھی جس کے اندر میں بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اے ایس آئی ملہوڑا اور پولیس کے دو جوان بس میں داخل ہوتے انہوں نے عبداللہ اور زینہ سے کہا کہ وہ دونوں نیچے اتر آئیں۔ عبداللہ شاید پولیس والوں کو پہچان نہیں سکا تھا۔ اُس نے کہا۔

”کیا بات ہے جوانو، جو بات کرنی ہے میں پر کرو“ اتنے میں زینہ بھی پٹاخ پٹاخ بولنے لگی۔ وہ بڑی ہوشیار عورت دکھائی دیتی تھی۔ بس کی تمام سواریاں یہی

گھبراہٹ میں لوگ ایسی ہی اُٹھی سیدھی ہانکنے لگے ہیں۔ میں نے بوٹ کی ٹھوکر عبداللہ کی کمر پر لگا کر کہا ”چل ہاں پتھر اُتھانے تیری پیری مُردی میں دیکھتا ہوں نہ تو کو صورتِ حال اور اپنے بیانون کی گرد بڑ کا بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ میں چاہتا بھی ہو تھا۔۔۔۔۔ ورنہ جس قسم کی وہ لڑکی تھی اُٹھانے جلتے جاتے اُس نے بے حد شور مچانا تھا۔ عام سی واردات تھی لیکن۔۔۔۔۔ شام سے پہلے پہلے زہینہ اور عبداللہ نے سب کچھ اُگل دیا۔ کیس بالکل دامنغ تھا۔ زہینہ نے اپنے کردار سے عورت کا ایک نہایت گھناؤنا رُوپ پیش کیا تھا۔ وہ دیشمال کی رشتے دار اور نہایت فزیبی سیبی تھی۔ دراصل

وہ جھاڑ پھونک کے لئے اُسے وقتاً فوقتاً اپنے گھر بلانے لگا۔ ریشماں بیچاری ان باتوں کو نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اپنے مجازی خدا کو خوش کرنے کے لئے سب کچھ کر رہی تھی۔ اُس کے دل میں بس یہی آرزو تھی کہ کسی طرح لڑکے کی ماں بن کر اپنے محبوب خاوند کو خوش کر سکے۔ دوسری طرف زہینہ لطیف سے ملی اور بڑی ہوشیاری سے اس کے دل میں ریشماں کے خلاف شبہات ابھارنے لگی۔ ان کی ازدواجی زندگی میں

وہ جھاڑ پھونک کے لئے اُسے وقتاً فوقتاً اپنے گھر بلانے لگا۔ ریشماں بیچاری ان باتوں کو نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اپنے مجازی خدا کو خوش کرنے کے لئے سب کچھ کر رہی تھی۔ اُس کے دل میں بس یہی آرزو تھی کہ کسی طرح لڑکے کی ماں بن کر اپنے محبوب خاوند کو خوش کر سکے۔ دوسری طرف زہینہ لطیف سے ملی اور بڑی ہوشیاری سے اس کے دل میں ریشماں کے خلاف شبہات ابھارنے لگی۔ ان کی ازدواجی زندگی میں

دراڑیں پڑنے لگیں۔ پھر ایک روز زینہ نے عبداللہ سے کہا کہ وہ ریشماں کو رات کے وقت اپنے پاس بلاتے۔ عبداللہ نے ایسا ہی کیا اُس نے ریشماں کو بتایا کہ اُس کے علاج کا اب آخری مرحلہ باقی رہ گیا ہے۔ اُسے رات کے وقت اُس کے گھر کی چھت پر چلہ کاٹنا ہوگا۔ اس چلے کے بعد اُس کی مراد پوری ہو جائے گی۔ خاوند کی خوشنودی کے لئے ریشماں یہ بھی کرنے کو تیار ہو گئی۔ دوسری طرف زینہ نے لطیف کو ہوشیار کر دیا اور کہا کہ اس کی بیوی اپنے یار کے گھر جا رہی ہے۔ اگر وہ اپنی عزت بچانا چاہتا ہے تو بچالے۔

جب ریشماں عبداللہ کے گھر جانے کے لئے گاؤں سے روانہ ہوئی لطیف کھیتوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ اُس نے ریشماں کا پیچھا کیا اور نہر کے کنارے سرکنڈوں میں اُسے روک لیا۔ خاوند کی غضبناک صورت دیکھ کر ریشماں کے ہوش اڑ گئے۔ لطیف کی آنکھوں پر نرسکوک کا پردہ تھا اور غصے سے اس کی صورت جگڑی ہوئی تھی۔

ظاہر ہے اُس نے ریشماں سے پوچھا ہوگا کہ وہ رات کہاں گزارنے جا رہی ہے، خوف زدہ ذہن سے کوئی جواب نہ بن پایا ہوگا۔ خاوند اپنی پاکدامن بیوی کو گھسیٹتا ہوا نہر پر لے آیا ہوگا۔۔۔۔۔ کمزور عورت نے بتیانا نہ لگا ہوں سے غیظ و غضب سے بھرے شہر کی طرف دیکھا ہوگا، اپنی معصوم بچیوں پر نگاہ دوڑاتی ہوگی۔۔۔۔۔ اور چہچہازی خدا کا دھکا کھا کر نہر کے پانی میں منہ چھپا لیا ہوگا۔

شاید ماں کے ڈوبنے کا منظر دیکھ کر بڑی لڑکی ڈر کر بھاگی تھی۔ اُس کے فراک کی دھجی کنارے سے ہٹ کر ایک جھاڑی میں پھنسی ہوئی تھی غیظ و غضب میں بھرا ہوا باپ معصوم بیٹی کے پیچھے لپکا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ سرکنڈوں میں چھپ گئی ہو۔

اُس نے اُسے وہاں سے پکڑا تھا اور نہر کے کنارے پہنچ کر نہایت سنگدلی سے دونوں بچیوں کو لمروں کے سپرد کر دیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن ابھی اس کے اندر جھڑکی ہوئی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ وہ عبداللہ سے بھی بدلہ چکانا چاہتا تھا۔ دوسرے روز وہ چپکے سے عبداللہ کے دیرے پر پہنچا تھا۔ وہاں زینہ کے ساتھ ساتھ عبداللہ کے چیلے چائے بھی موجود تھے۔ زینہ نے اُس کی طرف ناخاندانہ نگاہوں سے دیکھا۔ ایک لمحے میں لطیف سب کچھ جانپ گیا۔ اس کی آنکھوں پر بندھی ہوئی ٹپی ایک ہی جھلکے سے اُتر گئی۔ وہ اپنے اصل دشمن کا چہرہ بے نقاب دیکھ رہا تھا۔ وہ حجتاً ہوا زینہ پر بھینٹا لیکن عبداللہ کے آدمیوں نے اُسے راستے ہی میں دبوچ لیا۔ زینہ نے فخریہ انداز میں اُسے بتایا کہ اُس نے اپنے بیوی بچوں کو ناحق قتل کیا ہے۔ لطیف نے دیوانوں کی طرح چیخا پلانا شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے اُسے پہلے تو زبردستی ششہ بلایا پھر سر پر لٹھیاں مار مار کر ہلاک کر دیا تب جلد اللہ کے آدمیوں نے لاش کو اٹھایا اور رات کی تاریکی میں ریلوے لائن پر ڈال آئے۔

خودکشی کی ایک عام سی واردات کے نتیجے میں ایک نہایت گھناؤنی سازش بچھنی ہوئی تھی۔ زینہ، عبداللہ اور اُس کے دو آدمیوں پر مقدمہ چلا۔ چاروں کو چودہ چودہ سال قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ پانچویں مجرم لطیف کو سزائے موت ہوئی تو بے جا ہوگا۔ اس شخص کو مرنا ہی چاہیے تھا اور ایسے ہی اذیت ناک طریقے سے مزاجا ہیئے تھا جیسے وہ مرا۔ اُس نے بے گناہ بیوی اور معصوم بچوں کو صفائی کا موقع دیتے بغیر موت کی سزا دے دی تھی۔۔۔۔۔ اب بھی کبھی کبھی مجھے ایک عورت کی جھلک یاد آ جاتی ہے جو ایک پکدار صبح کو اپنے خوش و خرم بچوں کو انگلی سے لگاتے رہا پورہ، تھانے کے سامنے سے گزری تھی۔

سیتا، سیٹھ اور کامنی

جب سے میں نے سیارہ ڈائجسٹ میں اپنی یادداشتیں لکھنی شروع کی ہیں۔ کئی
یسے واقعات بھی یاد آرہے ہیں جو شاید ہمیشہ ہمیشہ میرے ذہن کے سرد خانوں میں پڑے
ہوتے۔ مجھے کسی دانشور کا قول یاد آرہا ہے کہ ذہن ایک ایسی الماری کی طرح ہے جس
میں مختلف یادیں مختلف خانوں میں پڑی رہتی ہیں۔ جب ہم کسی واقعے کی یاد تازہ کرنے
لے کوئی خانہ کھولتے ہیں تو اس مخصوص واقعے کے ساتھ ساتھ اور بھی بے شمار
اتحاد ہمارے نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی آج کل کچھ ایسا
ماہور رہا ہے۔ امرتسر کے گرد و فواح کے حوالے سے کئی خوابیدہ داستانیں انگریزانی
لے کر بیدار ہو گئیں ہیں اور مجھے خود پر حیرت ہو رہی ہے کہ ایک زمانے میں میں
ماہر مصروف یا "بلال شاہ" کی زبانی مارا ماری کی زندگی گزارتا رہا ہوں۔ ان
عادت میں امرتسر ہی کی ایک اور کہانی پیش خدمت ہے۔

کار اور لڑکی

اُن دنوں میں جنوبی علاقے کے تھانے میں تعینات تھا۔ ایک رات میں ابھی

گھر میں کھانا کھا کر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ اُن دنوں گاڑیاں شاذ و نادر ہی ہوتی تھیں۔ کسی گاڑی کی آمد پر میرا چونکا لازم تھا حسب توقع دروازہ بعد دروازے پر دسک ہوتی۔ دسک کی آواز سے میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی عورت ہے۔ میری بیوی صحن میں تھی۔ میرے اٹھنے سے پہلے ہی وہ دروازے پر پہنچ گئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک جوان سال لڑکی کھڑی نظر آئی۔

لڑکی اپنے لباس سے تعلیم یافتہ اور متمول خاندان سے لگتی تھی۔ اُس نے ایک خوبصورت چادر لپیٹ رکھی تھی اور اُس کے بے سیاہ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ میری بیوی نے دروازے سے ہٹ کر اُسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ صحن میں روشنی تھی۔ میں نے لڑکی کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اُس کی عمر ہشکل میں بائیس سال ہوگی۔ روشن آنکھوں والی وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی لیکن میں پہلی نظر میں ہی بھانپ گیا کہ وہ کوئی گھمبیر مسئلہ کریمے پاس آئی ہے۔ اندر داخل ہو کر اُس نے مجھے منٹے کیا۔ میری بیوی نے اُسے کمری پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ دراز جھکمتی ہوتی کمری پر بیٹھ گئی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

”بی بی کہاں سے آئی ہو؟“ اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی میری بیوی بولی۔
 ”یہ بیچاری صبح بھی آئی تھی مجھے آپ کو بتانا یاد نہیں رہا۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔
 یہ لوگ ہمیں امرتسر میں رہتے ہیں۔“

”ہاں بی بی بتاؤ۔ کیا مسئلہ ہے تمہارا؟“ میں نے لڑکی سے پوچھا۔ جواب دینے کی بجائے اُس نے چادر کے پلو سے آنسو پونچھنے شروع کر دیئے۔ میری بیوی میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اس کا والد لکڑی کا ایک بڑا تاجر ہے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ پچھلے

دنوں کچھ لوگوں نے اس کے والد کو اغوا کر لیا ہے۔

تب سارا واقعہ مجھے یاد آگیا۔ قریباً دس روز پہلے امرتسر کا ایک معروف کاروباری شخص کنہیا لال اغوا ہو گیا تھا۔ قبائلی علاقے کے کچھ لوگوں سے اس کا لین دین کا جھگڑا چل رہا تھا۔ وہی لوگ اُسے اٹھا کر اپنے علاقے میں لے گئے تھے۔

واقعات کے مطابق چند روز پہلے کچھ چٹان کنہیا لال کے پاس آئے تھے وہ دو دن امرتسر میں اس کے پاس رہے۔ بعد میں انہوں نے کہا کہ وہ اُسے پشاور کے ایک شخص سے بھاری رقم سود پر لے کر دے سکتے ہیں۔ کاروبار کی حالت ٹھیک کرنے کے لئے کنہیا لال کو رقم کی اشد ضرورت تھی۔ وہ اُن کے چپکے میں آگیا۔ یوں وہ لوگ اُسے درغلا کر لے گئے۔ کنہیا لال کے میجر نے تھانے میں جو ابتدائی رپورٹ درج کروائی تھی اُس میں تین افراد گھریزخان، حبیب گل اور خباب گل کے نام درج کرائے گئے تھے۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ یہ لوگ کنہیا لال کو اُس کی گاڑی اور ڈرائیور سمیت اغوا کر کے لے گئے ہیں۔

پانچویں روز کنہیا لال کا ڈرائیور واپس امرتسر آگیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ سیٹھ صاحب کو وہ لوگ قبائلی علاقے میں لے گئے ہیں پہلے انہیں پشاور سے آگے کوہاٹ لے جایا گیا تھا۔ وہاں ایک دن رکھنے کے بعد وہ لوگ انہیں براستہ سرک کرم ایجنسی میں لے گئے یہاں پہنچ کر ڈرائیور کو چھوڑ دیا گیا تاکہ وہ واپس پہنچ کر کنہیا لال کے لواحقین کو اطلاع دے سکے۔ انہوں نے سیٹھ کی واپسی کے لئے بیس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔ بیس لاکھ روپے ان دنوں بڑی رقم تھی اور اغوا کرنے والوں کے مطابق یہ رقم کنہیا لال کے ذمے واجب الادا تھی۔

اس سے پہلے ایک پولیس پارٹی صوبہ سرحد روانہ کی جا چکی تھی لیکن اس کی طرف

سے ابھی تک کوئی حوصلہ افزا رپورٹ نہیں ملی تھی۔ ابتدا میں ان لوگوں نے مقامی حکام کے ذریعے اغوا کرنے والوں سے کچھ بات چیت کی تھی لیکن اس بات چیت کے نتیجے میں حالات سلجھنے کی بجائے اور پیچیدہ ہو گئے تھے۔ یہ سارے کے سارے واقعات چند ثانیے میں میری نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے۔ میں نے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھی مغموم صورت لڑکی کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ میری نگاہوں کا مقہوم سمجھتے ہوئے وہ بولی۔

”میں اُن کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میرے پتا کو آپ لوگ کب واپس لائیں گے۔ اُن کے سوا میرا اس دُنیا میں کوئی نہیں۔ میں اُن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی“ وہ پھر ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ ملازم کو چلے وغیرہ کا کہے۔ پھر میں لڑکی کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ دو روکر ہلکان ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر جلد ہی اُس کے پتا کو چھڑانہ لیا گیا تو وہ لوگ انہیں ہلاک کر دیں گے۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے باپ سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور اس کی جدائی بُری طرح محسوس کر رہی ہے۔ وہ برہمن خاندان کی ایک سلجھی ہوئی ذہین لڑکی تھی۔ لاہور گورنمنٹ کالج سے اس نے حال ہی میں بی اے کیا تھا۔ اس کی ماں فوت ہو چکی تھی اور اب اس کا سب کچھ اس کا باپ تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا نجانے لوگ مال و زر کے تعاقب میں اتنی دُور کیوں نکل جاتے ہیں کہ اُن کی عزیز ترین بیٹیاں بھی ان کی صورت کو ترس جاتی ہیں۔

لڑکی کا نام شیدا تھا۔ وہ قریباً ایک گھنٹہ ہم میاں بیوی کے پاس بیٹھی رہی۔ وہ اس سے پہلے کیسوں کے سلسلے میں میرا نام سُن چکی تھی اور غائبانہ طور پر مجھ سے متاثر

نظر آتی تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ مجھے کوئی جتناقی قسم کی چیز سمجھ رہی ہے کہ اُدھر میں نے اُس کی مدد کی حامی بھری اور اُدھر اُس کا باپ دشمنوں کے چنگل سے آزاد ہو کر اُس کے سامنے آ موجود ہوا۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی بد اگر مجھے کسی پر بھروسہ ہے تو وہ آپ ہیں۔ صرف اور صرف آپ ہی میرے پتا کو واپس لاسکتے ہیں۔ نجانے کس نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی۔ بہر حال میری اتنی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ میں اُس کے معصومانہ اعتبار کو ٹھیس پہنچا سکتا۔ یوں بھی میرے علاقے کا کیس تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اُس کے والد کی برآمدی کی پوری کوشش کروں گا۔

ہندو ڈمی ایس پی نئی مصیبت

اگلا دن میں نے ابتدائی تیاری میں گزارا۔ میں نے ایک تفتیشی پارٹی لے کر خود مصوبہ سرحد جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ میرا بھرج بلال شاہ اس کیس میں خاصی سرگرمی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اُس کی غیر معمولی دلچسپی میرے لئے حیرت کا باعث تھی۔ لیکن جلد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ دراصل بلال شاہ، سینا اور اُس کے پتا کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ کسی وقت سیٹھ کنہیا لال کے لئے کام کرتا رہا تھا۔ اس کی اس قسم کی حرکتوں کا مجھے علم تھا۔ وہ پارٹ ٹائم ریجوری میجر کا کام بھی کرتا تھا۔ کسی نہ کسی کاروباری شخص کے ساتھ منسلک ہو کر وہ اُدھار وغیرہ کی قسطیں وصول کرتا تھا۔ اس کام کے عوض کبھی اُسے کچھ پیسے مل جاتے تھے اور کبھی صرف لٹائی جھگڑا ہی جتے میں آتا تھا۔ دراصل اُسی نے سینا کو میرے بارے میں بتایا تھا اور اُسے یہاں بھیجا تھا۔

ان لوگوں نے ایک قلعہ ملاحی کے اندر مضبوط مورچہ بندی کر رکھی ہے۔ ہم نے کوشش کی کہ مقامی انگریز کشتراں معاملے میں مداخلت کرے۔

کشمیریہ بات سمجھتا تھا کہ معاملہ نہایت گھمبیر ہے اور فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر سکتا ہے اس نے ذاتی طور پر مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی۔ انخوائندگان کے تین نمائندوں نے پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے مقامی حکام سے ملاقات کی سیٹھ کی نمائندگی اُس کے ایک بھائی اور میجر نے کی۔ دو دن کی گفت و شنید کے بعد یہ باتیں طے پائیں سیٹھ کنہیا لال چار لاکھ روپے فی الفور ادا کرے گا۔ باقی رقم دو دو لاکھ روپے کی قسطوں میں آٹھ ماہ کے اندر ادا کی جائے گی۔ اگر سیٹھ قسط کی ادائیگی میں تاخیر کرے گا تو اسے مقررہ کردہ شرح کے مطابق ہرجانہ دینا ہوگا۔ سیٹھ کو کشمیر کی ذمہ داری پر رہا کیا جائے گا۔ اگر سیٹھ رقم دینے سے انکاری ہوگا تو مقامی حکام ہر طرح سے اس کے ذمے دار ہوں گے۔

تمام باتیں تقریباً طے پا چکی تھیں۔ لیکن ایک واقعے کی وجہ سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ مذاکرات میں شریک ہونے والے پولیس آفیسرز میں ایک ہندو ڈی ایس پی بھی شامل تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے قبائلی پٹھانوں سے کہہ دیا کہ تم لوگ یوں تو قبیلہ پھرتے رہتے ہو لیکن جب پیسے کی بات آئے تو دھرم و صرم سب بیچ دیتے ہو۔ پٹھانوں میں گلریز خاں نامی شخص نہایت جوشیلا تھا۔ اُس نے ہندو ڈی ایس پی کو ترکیہ ترک کر دیا۔ اس سے پہلے کہ دوسرے ارکان معاملے کو سمجھاتے ہندو ڈی ایس پی نے گلریز خاں کو تھپڑ مار دیا۔ گلریز خاں نے ایک لٹھ ضائع کئے بغیر خنجر نکالا اور ڈی ایس پی پر حملہ آور ہو گیا۔ پک بھجکے میں مذاکرات کی میز میدان جنگ بن گئی۔ گلریز خاں کو تو پکڑ لیا گیا لیکن باقی دو قبائلی افراد فوری میں فرار ہو گئے۔

بہر حال اگلے دن میں تعیناتی پارٹی کے ساتھ بذریعہ ٹرین پشاور روانہ ہوا۔ پشاور سے بس کے ذریعے ہم کوہاٹ پہنچے۔ پہلے آنے والی تعیناتی پارٹی کا انچارج انپیکٹر شجاع تھا۔ انپیکٹر شجاع کی کارکردگی خاصی ناقص رہی تھی پچھلے چار پانچ دن سے یہ لوگ میرپاٹے اور تاش کھینے میں مصروف تھے۔

میں کوہاٹ پہنچتے ہی مقامی حکام سے ملا۔ کوئی ایک گھنٹے کے تبادلہ خیال اور دوپہر کے کھانے کے بعد ہم ”ٹل“ شہر روانہ ہو گئے۔ ٹل میں اگلے روز دوپہر تک بھاگ دوڑ جاری رہی۔ تیسرے سپریم پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے انخوائندگان سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ لوگ سیٹھ کو ”پارہ چنار“ کے ایک نوچی گاؤں میں لے گئے تھے۔ مقامی پولیس نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا۔ ہم نے توقف اختیار کیا کہ تنازعہ حل کرنے کے لئے کنہیا لال کو مقامی پولیس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ ملزم پارٹی اس تجویز پر کسی صورت راضا مند نہیں ہو رہی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ مجوس کو پولیس کی تحویل میں دینے سے پیشتر دوسری شرائط طے کی جائیں۔

ملزموں نے سیٹھ کے انخواسے قبل خاصی منصوبہ بندی کی تھی۔ انہوں نے اپنے بال بچوں کو محفوظ مقام پر منتقل کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے دفاع کا بھی معقول انتظام کر رکھا تھا۔ دراصل سیٹھ کنہیا لال کے ذمے جو رقم تھی۔ اُس میں کئی افراد شریک تھے۔ انخواسے بڑے تین ملزموں کا سیٹھ سے براہ راست تعلق تھا۔ یہ تینوں افراد نہ صرف خود اُدھار پر بہت سی لکڑی کنہیا لال کو دے چکے تھے بلکہ کئی دوسرے لوگوں کی رقم بھی اس کام میں پھنسا چکے تھے۔ اب یہ سب افراد جن کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ تھی۔ مقامی پولیس کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔ ایک مقامی مجر نے اطلاع دی تھی کہ

ہندو ڈی ایس پی کے شانے پر بھجرا کر اڑھایا تھا۔ وہ بیہوش ہو گیا اور اُسے فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا۔۔۔۔۔ مذاکرات کامیابی کے قریب پہنچ کر بری طرح ناکام ہو گئے تھے اب کنٹیا لال کی زندگی خطرے میں تھی۔ عین ممکن تھا کہ قبائلی پیش میں آکر اُسے ہلاک کر دیتے۔ میری نگاہوں میں اس کی مصوم بیٹی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس نے جس طرح مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا تھا اس کا تقاضہ تھا کہ میں فوری طور پر کچھ کروں۔ یہاں مذہب برادری یا قوم کا سوال نہیں تھا۔ ایک انسان کی زندگی خطرے میں تھی اور قانون کا محافظ ہونے کے ناطے میرا فرض تھا کہ اس کی جان بچانے کی کوشش کروں۔

ڈاکٹر کیٹ لیکشن

قبائلی فرار ہو گئے تھے اور براہ راست کارروائی ضروری ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے ساتھی آفیسرز سے مشورہ کیا اور فوری طور پر چھاپے کا منصوبہ بنایا۔ کچھ ساتھیوں کا خیال تھا کہ گلریز خان پر سختی کر کے طور مود کے ٹھکانے کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ لیکن میں گلریز خان کے تیور دیکھ چکا تھا مجھے یقین تھا کہ اس شخص سے کچھ اگلا کرنے کی کوشش وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔ بہر حال ایس پی صاحب کے حکم کے مطابق گلریز خان پر تھڑو ڈوگری ہسپتال کی گئی۔ دو گھنٹے میں وہ تین دفعہ بیہوش ہوا لیکن اس نے ہندو ڈی ایس پی کو گالیاں دینے کے سوا زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ میں نے بہت کم لوگوں کو اس قدر سخت جان دیکھا ہے۔

شام کو جب ہماری چھاپہ مار پارٹی روانہ ہونے والی تھی کمشنر کی طرف سے مقامی ایس پی کو خاص طور پر اس بات کی ہدایت کی گئی کہ وہ خود دھچپاے کی قیادت

کریں۔ لہذا ایس پی کی نگرانی میں ہم عشاء سے کچھ دیر پہلے اس گاؤں کے نواح میں پہنچ گئے جہاں سیٹھ کنٹیا لال کو مجبوس کیا گیا تھا۔ پولیس پارٹی نے ایسا راستہ اختیار کیا تھا جو عام آبادی سے ہٹ کر تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض میٹل میدان تھا۔ دُور دُور تک پھیلنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی تھی۔

مجرور نے ملزموں کے ٹھکانے کی نشاندہی کی۔ گاؤں کی بیرونی حدود کے ساتھ ایک بہت بڑا مکان نظر آ رہا تھا۔ ایک بڑے احاطے کے گرد مٹی کی اونچی دیوار بنائی گئی تھی۔ دیوار کا جو حصہ نظر آ رہا تھا اس کے دونوں سروں پر دو اونچی برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایسی برجیاں ان علاقوں میں عام دیکھنے میں آتی تھیں۔ برجیوں پر پھر میڈل کی موجودگی لازمی تھی۔ ایس پی صاحب نے مجھے ایک سپاہی کے ساتھ آگے بھیجا تاکہ میں مکان کا قریب سے جائزہ لے سکوں۔ میں سپاہی کے ساتھ رنگینا ہوا کوئی سربگز آگے گیا۔ وہاں سے برجیوں میں حرکت کرنے والے ہیولے صاف نظر آ رہے تھے۔ حویلی کے اگوتے دروازے پر بھی مسلح افراد پہرہ دے رہے تھے لگتا تھا۔ قبائلی حالات کو سمجھ رہے ہیں اور کسی بھی حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد ہیں۔

صورت حال حوصلہ شکن تھی۔ واپس جا کر میں نے ایس پی صاحب سے تمام ماجرا بیان کیا۔ براہ راست کارروائی کے لئے صورتحال کسی طور بھی مناسب نہیں تھی۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ جس شخص کی جان بچانے کے لئے سب کچھ کیا جا رہا تھا۔ وہ مکان کے اندر موجود تھا۔ ایس پی صاحب سوچ میں ڈوب گئے۔ میں نے اپنی تجویز پیش کرنے کے لئے موقع مناسب جانا۔

میں نے کہا۔ ”ایس پی صاحب۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اکیلا حویلی کے

اندر گھسنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

میں نے انہیں بتایا کہ میں نے ایک چھوٹی سی برساتی نالی دیکھی ہے جو بالکل خشک ہے۔ میں اُس کے اندر گھستا ہوا حویلی کی بیرونی دیوار تک پہنچ سکتا ہوں۔ اس منصوبے میں خطرہ ضرور تھا لیکن چونکہ میں خود پیش کش کر رہا تھا۔ اس لئے ایس پی صاحب نے تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد اجازت دے دی۔ یہاں میں یہ بتا دوں کہ حویلی کے دوسری طرف سے ”ریڈ“ کرنے کا خیال اعلیٰ سطحی میٹنگ میں متفقہ طور پر رد کر دیا گیا تھا۔ چونکہ اس طرف آبادی تھی۔ اس لئے ملزموں کا ہوشیار ہو جانا یقینی تھا۔ اور ان کے ہوشیار ہونے کا مطلب تھا کہ نبیالال کی موت۔

”اوہ میں مر گیا۔“

ایس پی صاحب نے ایک مقامی اے ایس آئی کو میرے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ کیا لیکن چونکہ وہ اچھی طرح اُردو نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی تفتیشی پارٹی کے سب سے سرگرم رکن یعنی ”بلال شاہ“ کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ بلال شاہ کے چہرے پر ایک رنگ سا اُگر گز گیا اور اُس کی سرگرمی ماند پڑتی محسوس ہوتی لیکن پھر اُس نے خود کو تیار کر لیا۔ ہم دونوں تاریکی میں رہ گئے ہوتے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ پروگرام یہ طے پایا تھا کہ حویلی کے اندر میں اکیلا جاؤں گا۔ اندر گھسنے کے بعد میں یہ کوشش کروں گا کہ انتہائی خاموشی سے سیٹھ کو لے کر احاطے کے اندر ہی کہیں روپوش ہو جاؤں۔

روپوش ہونے کی صورت میں میں ہوائی فائر کروں گا اور اس کے ساتھ ہی

چھاپہ مار پارٹی حرکت میں آجائے گی۔ اگر یہ صورت ممکن نہ ہوتی تو میں سیٹھ کے ساتھ حویلی سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔ اس صورت میں میں یکے بعد دیگرے تین فائر کروں گا۔ پولیس پارٹی پوری شدت سے برجیوں پر فائر کھول دے گی اور میں سیٹھ کے ساتھ بھاگتا ہوا محفوظ دُور ہی تک پہنچ جاؤں گا۔

لیکن ان دونوں صورتوں کے علاوہ بھی بہت سی صورتیں ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھیں جس کے نتیجے میں ایس پی سمیت تمام افراد کے چہرے فکر مند دکھائی دے رہے تھے۔ بہر حال میں اپنے طور پر فخر محسوس کر رہا تھا کہ میں ایک دوسرے صوبے کی پولیس کے سامنے پنجاب پولیس کی اچھی مثال پیش کر رہا ہوں۔ میں بلال شاہ کے ساتھ رہینگتا ہوا برساتی نالی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔

وہاں سے حویلی کی بیرونی دیوار کوئی سو گز کے فاصلے پر تھی۔ برساتی نالے میں کمینڈوں کے بل ہم نے اپنے صبر آزما سفر کا آغاز کیا۔ بلال شاہ ہانپ رہا تھا اور بار بار اپنا سر نکال کر حویلی کی طرف دیکھتا تھا۔ اب معلوم نہیں وہ راستے کی ”طوالت“ سے خوفزدہ تھا یا حویلی کی ”قربت“ سے نہایت احتیاط سے کھسکتے ہوئے ہم قریب آدھ گھنٹے میں بیرونی دیوار تک پہنچ گئے۔ دیوار یہاں سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر تھی اور برجیاں ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ یہ بڑی اچھی بات تھی کہ حویلی کا مین گیٹ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بلال شاہ کا ہاتھ دایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پروگرام کے مطابق اب بلال شاہ کا کام اتنا تھا کہ میں اُس کے کندھوں پر پاؤں رکھ کے دیوار کے اوپر چڑھ جاؤں۔ پھر بلال شاہ کو وہیں برساتی نالے کے اندر لیٹ کر کارروائی ختم ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ ناگزیر صورت حال ہی میں بلال شاہ کو مدد کے لئے بلاؤں گا۔ دیوار کے پاس پہنچ کر پتہ چلا کہ اُس کی اونچائی میرے اندازے سے زیادہ ہے بہر حال قریب ہی ایک پتھر پڑا ہل گیا۔ بلال شاہ اس کے اوپر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو سکتا تھا۔ میں بلال شاہ کے کندھے پر بیٹھا اور وہ گاڑی کے بجک کی طرح آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے کندھوں پر پاؤں رکھ کے میں بھی کھڑا ہو گیا۔ میں نے ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن بلال شاہ کی طویل قامتی کے باوجود دیوار کا کنارہ اب بھی ایک فٹ دور تھا۔ بلال شاہ نے کہا: ”خان صاحب! میرے سر پر پاؤں رکھ لیں۔“

اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ جونہی میں نے بلال شاہ کے سر پر بوٹ جاتے اس کے منہ سے نکلا ”اوہ میں مر گیا۔“ تب مجھے یاد آیا کہ چند دن پہلے بلال غسل خانے میں پھسل گیا تھا اور اس کے سر پر تین ٹانکے لگے تھے۔

بہر حال اس وقت یہ سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ اتنا ہی خدا کا شکر تھا کہ اُس کی لاٹھ پیکر جیسی آواز کسی نے سنی نہیں تھی۔ میرا ہاتھ دیوار کی منڈیر پر پہنچ چکا تھا۔ اب اگلے قدم کے لئے مکمل خدا پر بھروسہ کرنا تھا۔ دیوار کے اوپر سے گزرتے ہوتے میں برجیوں پر سے نظر آسکتا تھا۔ بہر حال اللہ کا نام لے کر میں دیوار کے اوپر آیا اور اس پر لیٹ کر دوسری طرف لٹک گیا۔ جگر کی اطلاع کے عین مطابق احاطے میں کتنی جگہ کلڑی کے ڈھیر نظر آ رہے تھے۔ میں زمین پر کودا اور بھاگا ہوا کلڑی کے ایک ڈھیر میں چھپ گیا۔

آثار بتا رہے تھے کہ میں پہرے داروں کی نظر سے محفوظ رہا ہوں۔ سانسیں درست کرنے کے بعد میں نے دیوار اور نکالا اور آہستہ آہستہ احاطے کے آخر میں

واقع عمارت کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا قبائلیوں نے اپنی ساری توجہ جوہلی سے باہر مرکوز کر رکھی ہے۔ عمارت کے سامنے ایک بڑا برآمدہ تھا۔ وہاں دو عمر رسیدہ شخص چار پائیوں پر لیٹے تھے۔ شاید سو رہے تھے۔ میں دبے پاؤں اُن کے قریب سے گزر گیا۔ سامنے ایک کمرے میں لائٹن کی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی سے بھانکا اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں تو وہ کنہیا لال ہی تھا۔ وہ ایک چار پائی پر لیٹا تھا۔ میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ اُس کے قریب ہی ایک نوجوان گودیں بندوق رکھے دیوار سے ٹیک لگاتے ادنگ رہا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کام اتنا آسان ثابت ہو گا۔

میں نے کھڑکی میں آکر سیٹھ کو اپنی جھلک دکھائی۔ وہ پہلے تو بُری طرح چونکا پھر صورت حال بھانپ گیا۔ میں نے اُسے اشارہ کیا کہ وہ آہستہ آہستہ باہر آجائے۔ سیٹھ کی آنکھوں میں ایک لمبے کے لئے خوف کے سائے لہراتے۔ پھر اُس نے خود پر قابو پایا اور دبے پاؤں چلتا ہوا باہر آگیا۔ لیکن عین اس وقت ادنگ تھا ہوا نوجوان بیلا رہو گیا۔ میں نے جب اُس کی طرف دیکھا وہ دونالی بندوق کا رخ سیٹھ کنہیا لال کی طرف کر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ گولی چلانے ہی والا ہے۔ میں نے پستول کا رخ اس کی پیشانی کی طرف کیا۔ وہ بالکل نوجوان لڑکا تھا۔ مَس بھی پوری طرح نہیں بھیگی تھی۔ اس کے گلے میں تیج جھول رہی تھی۔ یہ سارا منظر سیکنڈے کے دسویں حصے میں میری آنکھوں کے سامنے کوندا۔ پستول کی نال خود بخود جھگ گئی۔ میں نے اس کی پیشانی کی بجائے اس کے ہاتھوں کو نشانہ بنایا۔ دھماکہ ہوا۔ بندوق اس کے ہاتھوں میں بُری طرح ڈگمگائی۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے اُسے چھاپ لیا۔ پستول

کا ایک بھر پور دستہ کھانے کے بعد وہ لہراتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

میرے خاڑکے ساتھ ہی جوہلی سے باہر دھاکوں کی آوازیں آنے لگیں۔

پولیس پارٹی نے ہتھ بول دیا تھا۔ میں اور سیٹھ کمرے کے درمیان کھڑے تھے۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی میں سیٹھ کو لے کر بھاگتا ہوا باہر نکلا اور لکڑی کے ڈھیر میں چھپ گیا، لیکن یہ جگہ کسی صورت چھپنے کے لائق نہیں تھی۔ عین اس وقت میری آنکھوں کے سامنے تین چار آدمی بھاگتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں کچھ دیر پہلے سیٹھ موجود تھا۔ ان کے ہاتھوں میں خنجر چمک رہے تھے۔ ذرا دیر بعد وہ غصے میں چلاتے ہوئے باہر نکلے اور صحن میں کچھ تلاش کرنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ وہ سیٹھ کی تلاش میں ہیں۔ اوپر سے تم یہ ہوا کہ بھاگنے سے سیٹھ کنیا لال کو کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ وہ کھانسی روکنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن لگتا تھا کہ اس کا دم اٹھ جائے گا۔ جوہلی سے بھاگو دوڑو کی آوازیں آ رہی تھیں اور قبائلی پولیس کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔ کھانسی کی شدت سے سیٹھ کا ہر حال تھا۔ عین اس وقت جب صحن میں سیٹھ کو تلاش کرنے والے ہمارے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ جوہلی سے باہر دستی ہوں کے دو دھاکے ہوئے اور پولیس دندنا تھی ہوئی بڑے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔

نبیا چکر چل نکلا

سیٹھ کو چھڑا لیا گیا۔ مگر خزان کے علاوہ حبیب گل، خباب گل وغیرہ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ سیتا کو اس کا پتہ لگ گیا۔ اب دیوانی و فوجداری کا ایک طویل چکر تھا اور

اس کے بعد کوئی فیصلہ ہونا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ کیس ختم ہو چکا تھا لیکن میرے نزدیک کیس ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کچھ عرصہ پہلے بلال شاہ، سیٹھ کنیا لال کے لئے رقوم کی وصولی کا کام کر چکا تھا۔ وہ سیٹھ کے بارے میں بہت سی اندرونی باتیں جانتا تھا۔ اس نے سیٹھ کا جو نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچا تھا۔ وہ مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ بلال شاہ کے مطابق سیٹھ کا رو باری ذہن کا ایک دیواندار آدمی تھا۔ یوں بھی کچھ عرصہ پہلے تک اسے کوئی بڑی عادت نہیں تھی۔ خرچہ نام کو تھا آمدن بے شمار جو کماتا تھا، وہ بینک بینکس کا حصہ بن جاتا تھا۔ بلال شاہ کے مطابق ظاہراً اسے کاروبار میں کسی قسم کا نقصان بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر کیا بات تھی جو وہ اتنا مفرط ہو گیا تھا۔ بلال شاہ کا خیال تھا کہ اس قرضے کے پیچھے کوئی ایسا راز ہے جس سے صرف سیٹھ اور اس کی بیٹی ہی واقف ہیں۔

میں نے بعد کی ملاقاتوں میں سیتا کو کریدنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا۔ آخر ایک روز میں نے لڑکی سے کھل کر بات کی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”دیکھو سیتا، تم کہتی ہو کہ میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں اور تمہ دل سے آپ کی احسان مند ہوں۔ لیکن تم ابھی تک مجھے اصل بات بتانے سے گریز کر رہی ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں نے تمہارے پتا کی برآمدگی کے لئے کتنی محنت کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری تمام قربانی راستیگاں چلی جائے گی۔ اگر میں اس بات کا کھوج نہ لگا سکا جس نے تمہارے پتا کو روڑ پتی سے تقریباً دیوالیہ کر دیا ہے۔ جاوید ابک رہی ہے اور تم لوگوں کی مالی حالت دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ تمہیں معلوم ہے تمہارے پتا جی

بے تحاشہ شراب پینے لگے ہیں۔ وہ پہلے ہی دل کے مریض ہیں۔ اگر صورت حال جوں کی توں رہی تو بہت جلد.... لڑکی نے بے چین ہو کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میری جذباتی تقریر کا مقصد بھی یہی تھا۔ یہ میرے تھانے کا کیس تھا اور میں اس کی تمام گتھیاں سلکھانا چاہتا تھا۔

سیتا نے رونا شروع کر دیا تھا اور مجھے پتہ تھا اب وہ دس منٹ سے پہلے خاموش نہیں ہوگی۔ میں صوفے پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ آخر وہ نارمل ہو گئی اُس نے کہا انسپکٹر صاحب! میں ان لوگوں میں کافی گھل مل گیا تھا لیکن وہ مجھے انسپکٹر ہی کہتی تھی! مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ پچھلے ایک سال میں پتہ جی بہت تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ پریشان رہتے ہیں۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود کثرت سے سگریٹ اور شراب پیتے ہیں لیکن اپنی پوری کوشش کے باوجود میں انہیں سمجھانے میں ناکام رہی ہوں۔ ایک وقت تھا جب وہ میری زبان سے نکل ہوتی بات کو پورا کرنے کے لئے ہزاروں روپیہ لٹا دیتے تھے لیکن اب وہ بات بات پر مجھے جھڑک دیتے ہیں۔ گھر میں بھی اُن کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے.... مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتی۔

سیتا اس طرح غابر کر رہی تھی جیسے وہ اپنے پتا کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی اور یہ بات کافی حد تک درست بھی تھی لیکن میں اس کی آنکھوں میں شک کی ایک مبہم تحریر دیکھ چکا تھا۔ اور میرا اندازہ تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جسے وہ چھپا رہی ہے۔ شاید خاندانی عورت اور وقار اُس کے اڑے آ رہا ہے۔ وہ سمجھ رہی ہے کہ اس بات کے انشا سے اُس کے پتا کی آن پر حرف

آتے گا۔

بہر حال سیتا کی شفاف آنکھوں میں ابھی افسوس موجود تھے اور میں سمجھ رہا تھا کہ لوہا ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا۔ میں نے ایک آخری ضرب لگاتے ہوئے کہا: ”اچھا ٹھیک ہے۔ سیتا ایک لائق آدمی سے تم اپنے گھر کی حالات چھپانے کا حق رکھتی ہو۔ مجھے افسوس رہے گا کہ میں تمہارے پتا کے کام نہ آ سکا۔ تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔ اچھا خدا حافظ“

میں نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ روکے گی۔ میں دروازے کے قریب پہنچا تو اُس کی آواز سنائی دی۔

”سینے انسپکٹر صاحب!“ میں نے مڑ کر دیکھا وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی اُس کے چہرے پر شدید ہجیان کے آثار نظر آرہے تھے۔ شاید کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر ملامت سے کہا۔

”سیتا دیوی! میں تمہارا دشمن نہیں خیر خواہ ہوں۔“

اُس نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ کتنی ہی دیر وہ خالی نظروں سے قائلین کو دیکھتی رہی پھر بولی ”انسپکٹر صاحب مجھے شک ہے کہ پتہ جی کے بدلے ہوتے روئے اور ان کی پریشانیوں کی وجہ اُن کی پرائیویٹ سیکرٹری ہے۔ اُس کا نام کامنی ہے۔ وہ جوان اور خوبصورت ہونے کے علاوہ بے حد آزاد خیال بھی ہے۔ مجھے اُس کے چال چلن پر شبہ ہے۔ دفتر کے علاوہ وہ ہمارے گھر بھی آتی رہتی ہے۔ میں اُسے کئی دفعہ پتہ جی سے تنہائی میں گفتگو کرتے دیکھ چکی ہوں۔ میرا خیال ہے اُس فیملی نے پتہ جی کو اپنے حُسن کے چال میں پھانس رکھا ہے۔“ اُس نے یہ سب کچھ ایک

سائنس میں اس طرح بتایا جیسے دل سے کوئی بڑا بوجھ اتار دیا ہو۔ میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا رہا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر وہ تعاون کرتی رہی تو بہت جلد ہم معاملے کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔

کامنی مشکوک تھی

دوسرے روز میں نے اپنے ایک اے ایس آئی کو کامنی کے بارے میں چچان بین کرنے کے لئے کہا۔ اُس نے اسی روز شام کو مجھے رپورٹ دی۔ سینٹا کے کہنے کے مطابق کامنی کی شہرت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ وہ شہر کے ایک فیشن ایبل علاقے میں اپنی ماں اور تین بہنوں کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ باپ فوت ہو چکا تھا۔ کوئی بھائی بھی نہیں تھا۔ اب وہی گھر کو چلا رہی تھی۔ یہ خیال کیا جاسکتا تھا کہ کامنی نے اپنی معاشی حالت کو سدھارنے کی غرض سے سیٹھ پر ڈورے ڈالے ہوں۔ اس روز میں سینٹا سے ملے گھر گیا۔ کوئی ایک گھنٹے کی مغز ماری کے بعد میں نے اُسے مجبور کر لیا کہ کامنی کی آمد پر وہ چھپ کر اپنے پتا کے ساتھ اس کی باتیں کئے۔

تیسرے روز سینٹا نے مجھے فون کر کے بلایا۔ اس نے بتایا کہ رات کامنی آئی تھی۔ وہ پتا کے ساتھ ان کے کمرے میں کوئی آدھ گھنٹہ موجود رہی پھر اُس نے جھکتے ہوئے وہ باتیں بتائیں جو اُس نے دروازے سے کان لگا کر سنی تھیں۔ اس نے بتایا وہ پتا سے کہہ رہی تھی۔ سب کچھ آپ کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ کہنیا صاحبہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچئے۔ آج رات اگر کوئی خاموشی سے شہر کی دیواروں پر آپ کی ”نیک نامی“ کے اشتہار لگا گیا تو کل کیا حیثیت رہے گی،

آپ کی دولت اور جائیداد کی سائنس لینا دو بھر ہو جائے گا آپ کو۔ پھر شاید موت بھی آپ کے خاندانی وقار کو پناہ نہ دے سکے۔

سینٹا نے چند فقرے اور بھی کئے لیکن اُن کا مطلب واضح نہیں تھا۔ بہر حال بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ سیٹھ کہنیا لال کو بلیک میل کیا جا رہا تھا۔ کسی جذباتی لمحے کی لرزش اُس کی زندگی کا روگ بن گئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کامنی سیٹھ کو خود سے شادی پر مجبور کر رہی ہو۔ جس کی وجہ سے وہ اپنا ذہنی سکون گنوا بیٹھا ہو۔ میں نے سینٹا کی طرف دیکھا اور مجھے احساس ہوا کہ آج پہلی بار اپنے پتا کے بارے میں اس کا رویہ بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اُس نے کہا۔

”جب کامنی پتا سے ملنے کے بعد کمرے سے باہر نکلی تو میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ میں نے اُسے سخت بُرا بھلا کہا۔ میں نے کہا تو عورت نہیں ڈاؤن ہے۔ ایک انسان کو بُرا دکر رہی ہے، ایک ٹیٹی سے اُس کا باپ چھین رہی ہے۔ اتنے میں پتاجی بھی کمرے سے نکل آئے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے بھر پکایا دینی شروع کر دیں بلکہ انہوں نے..... انہوں نے مجھے تھپڑ بھی مارا“

سینٹا پھر سکریاں لے کر رو رہی تھی۔ مزید دس منٹ ضائع کرنے کی بجائے میں نے اُٹھ جانا سب سمجھا۔

سہ پہر کے وقت میں تھانے میں بیٹھا اسی کیس پر سوچ و بچار کر رہا تھا۔ حالات اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ کامنی نامی یہ لڑکی سیٹھ کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُسے بلیک میل کر رہی ہے لیکن لڑکی پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری تھا کہ وہ اکیلی ہی یہ کھیل کھیل رہی ہے یا اُس کے ساتھ کچھ اور لوگ

بھی مصروف ہیں۔ میں سینکے کچھ اور معلومات بھی چاہتا تھا۔ میں نے اس کے گھر ٹیلیفون کیا۔ ایک نوکر نے بتایا کہ کل رات سینا اور اس کے باپ میں جھگڑا ہوا تھا۔ اور وہ گھر چھوڑ کر اپنی نانی کے ہاں چلی گئی ہے۔ معاملہ گھمبیر ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے فوری طور پر کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔

بلیک میل

میں نے ایک لے ایس آئی کو بھیجا اور وہ نہایت خاموشی سے کامی کو تھلنے لے آیا۔ میں جانتا تھا یہ ایک خطرناک کام ہے اگر کامی کے اور ساتھی بھی ہیں اور وہ تھلنے میں آکر بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی تو بلیک میلر اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آزاد ہوں گے۔ میں نے پہلے تو کامی سے نرمی سے پوچھ گچھ کی لیکن وہ ایک گہری لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ اُس نے کوئی کام کی بات نہیں بتائی۔

مجبوراً میں نے وہ انداز اختیار کیا جس کے بارے میں میرے ساتھی مذاقاً کہا کرتے تھے کہ نواز خان اسٹیکھوں سے لوگوں کی جان نکال لیتا ہے۔ میرے کڑے تنبور دیکھ کر وہ سہم گئی۔ میں نے اُسے بتایا کہ اُسے نہایت خاموشی سے تھلنے میں لایا گیا ہے۔ اور اگر میں چاہوں تو وہ کبھی اس چار دیواری سے باہر کی دُنیا نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا رنگ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ میں اس قسم کی دھمکی دینا نہیں چاہتا تھا لیکن فوری نتیجہ حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ وہ بُری طرح نروس ہو چکی تھی۔ چند منٹ میں اُس نے سب کچھ بتا دیا۔

اُس نے ایک بالکل نئی کہانی سنائی۔ اس کہانی سے سیٹھ کنہیا لال کی

زندگی کے ایک بالکل دوسرے رُخ پر روشنی پڑتی تھی۔ کامی کے مطابق سینا اپنے کالج کے زمانے میں ایک حادثے سے دوچار ہوتی تھی۔ وہ لاہور میں اپنی ایک ہندو سہیلی کے بھائی اور اُس کے دوستوں کے ہاتھوں اپنی عزت گنوا بیٹھی تھی۔ یہ سب کچھ بڑے عجیب انداز سے ہوا تھا۔ سینا اپنی سہیلی کے ہاں گئی لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھی اُس کا بھائی گھر میں تھا اُس نے سینا کو انتظار کرنے کے لئے کہا اور کوئی نشہ آور مشروب پلا دیا۔ بعد ازاں اپنے دوستوں کے ہمراہ اُس نے سینا پر مجرمانہ حملے کئے۔ اس انسانیت سوز واقع کی تصویریں کھینچی گئیں۔ سینا کی سہیلی بھی اس واقع میں براہِ ربریک تھی۔

در اصل یہ لوگ نہایت خطرناک قسم کے بلیک میلر تھے۔ تصویریں حاصل کرنے کے بعد انہوں نے سینا کے والد سے رابطہ قائم کیا۔ وہ جانتے تھے کہ کنہیا لال اپنی بیٹی کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ اس کے بہتر مستقبل کے لئے ہر قسم کی قربانی دے گا۔ اُن کے انداز سے سو فیصد درست نکلے۔ سیٹھ نے ان کا مُنہ بند رکھنے کے لئے بڑی بڑی رقوم دینی شروع کر دیں۔۔۔۔۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری تھا۔ اور شاید سیٹھ کی مکمل بربادی تک جاری رہنا تھا۔

میں خیرانی سے یہ روداد سن رہا تھا۔ ”لیکن مس کامی! کیا سینا کو اس بارے میں کچھ خبر نہیں؟“ کامی نے کہا۔

”انکسٹر صاحب! سینا کی بے خبری سے بلیک میلروں کی ہوشیاری ظاہر ہوتی ہے۔ وہ لوگ جانتے تھے اور میں بھی یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر وہ شرمناک تصویریں سینا دیکھ لیتی تو ایک لمحے کے لئے بھی زندہ رہنا گوارا نہ کرتی۔ میں اس کے مزاج

سے اچھی طرح واقف ہوں۔ سینا کے مرنے سے بیک میلر اُس لاکھوں روپے کی رقم سے محروم ہو جاتے جو وہ سیٹھ سے بٹور رہے ہیں۔ انہوں نے سیٹھ صاحب کو سب کچھ بتا دیا ہے لیکن ان کی بیٹی کو کچھ نہیں بتایا۔ سیٹھ صاحب کو معلوم ہے کہ سینا کی یہ تصویریں بدہوشی یا بیہوشی کی کیفیت میں اتاری گئی ہیں۔ شاید اب سینا کے ذہن میں اس واقع کی دھندلی سی تصویر بھی موجود نہ ہو لیکن اگر سیٹھ صاحب اُن کے رہا ہات ماننے سے انکار کریں گے تو اُن کی خاندانی عزت کا جنازہ تو نکلے گا ہی، اُن کی بیٹی بھی جان پر کھیل جائے گی۔

یہ نئے کامنی سے پوچھا: تمہارے علاوہ اور کس کس کو اس بارے میں معلوم ہے؟ وہ بولی: اس معاملے میں صرف میں ہی اُن کی راز دار ہوں۔ وہ بھی اس لئے کہ اُن کی ہر قسم کی ڈاک کو پہلے میں کھولتی ہوں، کچھ دیر خاموش رہ کر بولی: انسپکٹر صاحب! سیٹھ صاحب فطری طور پر ایک شریف النفس آدمی ہیں۔ وہ جس عذاب سے گزر رہے ہیں وہ صرف میں جانتی ہوں۔ اسی لئے اُن کی دلجوئی کے لئے میں اُن کے پاس آتی جاتی رہتی تھی۔ میں انہیں اپنے پتا سامان سمجھتی ہوں۔

ایس کی تصویریں

اس نئے موڑ کے بعد صورت حال کافی حد تک واضح ہو چکی تھی۔ میں نے سیٹھ کنہیا لال کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ میں اس سے ملا وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ ایک بار تو مجھے بھی اس پر ترس آ گیا۔ خاندانی وقار کو بچانے کے لئے اور بیٹی کے مستقبل کی خاطر وہ کس قدر مضائقہ برداشت کر رہا تھا۔ ایک طرف اُسے

قرض خواہ کھینچ رہے تھے اور دوسری طرف بلیک میلر میں نے سیٹھ کو اس بات کا یقین دلایا کہ اُس کی آن پر حوت نہیں آئے گا۔ جو باتیں راز ہیں وہ ہمیشہ راز رہیں گی۔ تباہی علاقے کی کارروائی کے دوران وہ میری صلاحیتوں کا معترف ہو چکا تھا۔ میری یقین دہانی پر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اُس نے اٹھ کر میرے پاؤں پچرنے کی کوشش کی لیکن میں نے شانوں سے تھام کر اُسے اٹھالیا۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد کنہیا لال مجھے بلیک میلروں کے اس گروہ کے بارے میں معلومات فراہم کر رہا تھا۔

بلیک میلروں کا گروہ دراصل چار دوستوں پر مشتمل تھا۔ ان کا سرغنہ ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج کا ناخلف بیٹا تھا۔ کچھ لوگوں کو انہوں نے بلیک میلنگ کے ذریعے بھی اپنے ساتھ شامل کر رکھا تھا۔ لاہور کی ہندو آبادی ماڈل ٹاؤن کے تھانے کے انچارج کے سائنڈل کر میں نے ایک ہفتے تک سرگرمی سے چھان بین کی۔ بلیک میلروں کے گرد گھیرا مضبوط اور تنگ کرنے کے بعد ہم نے بھرپور کارروائی کا فیصلہ کیا۔ اگلے روز شہر کے مختلف حصوں سے چار سرغنوں سمیت اٹھائیس افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔

ان میں سے آٹھ افراد کو چھان بین کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ جبکہ باقی میں افراد کے خلاف چالان کی تیاری شروع کر دی گئی۔ بڑی بڑی سفارشیں آئیں لیکن میں اعلیٰ افسروں کو پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ کوئی سفارش قبول نہیں کی گئی۔ میں نے سیٹھ سے جو وعدہ کیا تھا اُسے پورا کیا۔ سینا کے معاملے کو بالکل حذف کر دیا گیا۔ یوں بھی ملزموں کے خلاف اتنا مواد اکٹھا ہو چکا تھا کہ وہ قرار واقعی منرا سے بچ نہیں سکتے تھے۔ کئی گشتہ مقدموں کی فائلیں حرکت میں آ گئیں اور کئی مل طلب کیے اپنے انجام کو پہنچے۔ چار بڑے مجرموں میں سے دو قتل کے

مرتجب بھی ہو چکے تھے انہیں چھانسی کی سزا ہوئی۔ جبکہ دو مجرموں کو عتر قید اور شاید آٹھ سو دس دس سال قید ہوئی۔

اس کیس کے حوالے سے مجھے ایک واقعہ زندگی بھر نہیں بھولے گا جس روز میں نے چھاپہ مارا اور مجرموں کو گرفتار کیا، اس سے اگلے روز میں مجرموں سے برآمد ہونے والی اشیاء کامعائنہ کر رہا تھا۔ ان میں ایک سفید لفافہ بھی تھا۔ جس پر ماڈل ٹاؤن ٹھکانے کے محرر نے لکھ رکھا تھا "ایس کی تصویریں"

بات معمولی تھی لیکن بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی۔ بلال شاہ کے مکان کے ساتھ ہی رحیم بخش کی جوہلی تھی۔ مکانوں کے درمیان ایک تھوڑی سی کنون مجاہدہ خالی رہ گئی تھی۔ یہی کوئی ایک مرلہ رقبہ ہو گا۔ رحیم بخش اور بلال شاہ دونوں کو اس جگہ کی ملکیت کا دعویٰ تھا لیکن چونکہ دونوں ہمایوں میں اچھے تعلقات تھے۔ اس لئے کافی عرصے سے یہ معاملہ دبا چلا آ رہا تھا۔ رحیم بخش گاؤں کا ایک کھانا پیتا زمیندار تھا۔ بلال شاہ چونکہ تھانہ، کچہری کو ٹھیک ٹھاک سمجھتا تھا۔ اس لئے اس کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا۔

رحیم بخش کی بیوی کا ذہنی توازن خراب تھا۔ پہلے بھی وہ کچھ کھوٹی کھوٹی رہتی تھی لیکن کچھ عرصے سے وہ بالکل ہی پاگل ہو گئی تھی۔ وہ عموماً "رام پورہ" کی گلیوں میں ننگے پاؤں گھومتی رہتی، کبھی ہوا میں ہاتھ نہچا سچا کرتی اور کبھی بچوں کو ڈرانے کے لئے ان کے پیچھے بھاگتی جو بات اُس کے ذہن میں ایک بار سما جاتی پھر مشکل ہی سے نکلتی تھی۔ آج کل اُس نے ایک نیا شغل اختیار کر رکھا تھا۔ روزانہ شام کے وقت مٹی کا ایک دیالہ کر گھر سے نکلتی اور اُس خالی جگہ میں جا کر بیٹھ جاتی۔ جو دونوں مکانوں کے درمیان واقع تھی۔ دیہاتی لوگ اس قسم کی باتوں کا اثر فوراً

میں نے اسے کہا تھا کہ باقی تمام تصویروں میں سے یہ تصویریں اور نیکیٹوڈ علیلہ لفافے میں ڈال دینا۔ یہ دراصل سینا کی تصویریں تھیں۔ میں کسی کام سے اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ جب ایک منٹ بعد واپس آیا تو سینا کمرے میں بیٹھی تھی اور لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں کمرے سے پاؤں تک لرز گیا لیکن پھر میں نے غصے سے کہا کہ لڑکی نے ابھی لفافہ کھولا انہیں۔ میں نے اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی اور باتوں میں لگا کر لفافہ اس سے لے لیا۔ وہ کامنی کے بارے پوچھ رہی تھی میں نے اس "پوچھناچھ" کے لئے پہلے سے تیاری کر رکھی تھی۔ جلد ہی میں اُسے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ کامنی کا اس معاملہ میں کوئی ہاتھ نہیں ہے اور یہ کہ اس کے پتا کو کچھ کاروباری پریشانیوں تھیں۔ جو اب دُور ہو گئی ہیں۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ اس کے پُرانے تپا "اب اُسے واپس مل جائیں گے۔ سینا کے رخصت ہونے کے بعد میں اُٹھا اور چلتا ہوا آتشدان کے قریب پہنچا۔ پھر میں نے بے پناہ نفرت سے لفافے کے ٹوٹے ٹکڑے کر کے آتشدان میں پھینک دیئے۔

قبول کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اس جگہ پر کسی بزرگ کا سایہ ہے اور ”اللہ رکھی“ کو اس جگہ دیا جلانے کی بشارت ہوتی ہے۔ بلال شاہ کو یہ بات سیدھی کیلیے میں لگتی تھی۔ وہ بڑی دیر سے اس جگہ کی آس لگائے بیٹھا تھا۔ ابھی تو صرف چند لوگ یہ بات کہہ رہے تھے لیکن بلال شاہ جانتا تھا کہ اگر یہ سلسلہ چلتا رہا تو کچھ دیر بعد لوگ اس جگہ کو باقاعدہ خانقاہ بنالیں گے۔

اُس نے اس مسئلہ پر کھل کر رحیم بخش سے بات کی۔ گفتگو کے دوران اُن میں تلخ کلامی ہو گئی اور نوبت ہاتھ پائی تک پہنچ گئی۔ رحیم بخش کے بڑے لڑکے نے بلال شاہ کو گالی نکالی اور اُس نے جواب میں ایک تھپڑ اُس کے منہ پر جڑ دیا۔ یہ ساری باتیں مجھے اپنے ایک سپاہی سے معلوم ہوئیں۔ اُس نے بتایا کہ ابھی چند لمحے پہلے میں کو رحیم کی ہینک میں جھکڑا ہوا ہے۔ ابھی بات ہمارے منہ میں ہی تھی کہ بلال شاہ طوفان کی طرح تھانے میں داخل ہوا۔ وہ پاؤں تلخ پٹخ کر رکھ رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے کیلا بلال شاہ نہیں دس پندرہ آدمی تھانے میں داخل ہو رہے ہیں۔ اُس کے گلے کا پھانک کھٹا تھا اور وہ اونچی آواز میں رحیم بخش کو کوس رہا تھا۔

”خاں صاحب“ وہ آتے ہی دھاڑا ”یا تو آپ رحیم کو سمجھالیں یا خون خرابے کے تیار ہو جائیں۔“

”کیا بات ہے پھر کسی سے لڑ کے آئے ہو؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”لڑائی تو اب ہو گئی میرے سرکار۔“ وہ گڑھی پر پھیلتے ہوتے بولا۔ ”رحیم کو پتہ ہے تھڑ والی جگہ اُسے نہیں مل سکتی۔ وہ میری جگہ ہے سارے لوگ جانتے ہیں اب وہ میری جگہ کو خانقاہ بنانا چاہتا ہے لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے

بہت صبر کیا اب اور صبر نہیں کروں گا۔“

میں نے اُسے سمجھایا بھجایا اور ایک سپاہی کے ہاتھ رحیم کو بلوا بھیجا۔ اُس کے تیل بھی بدلے ہوئے تھے اور وہ بلال شاہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ اللہ رکھی ”سائیں لوک“ ہے وہ جو بھی کرتی ہے ہم ٹوکتے نہیں۔ اُس نے اپنی مرضی سے دیا جلانا شروع کیا ہے۔ ہم اُسے زیر دست نہیں روک سکتے۔ دوسری طرف بلال شاہ اپنی کسے جارہا تھا۔ جب اُس نے رحیم کی بیوی کو دو تین بار سیدھا سیدھا پاگل کرنا تو رحیم طیش میں آ گیا۔ دونوں اٹھ کر دست و گریباں ہو گئے۔ میں نے ہینک اٹھیں علیحدہ کیا۔ رات کوئی دس بجے ہینک میں اُن سے مغز کھپا رہا۔ دونوں کچھ نرم پڑ گئے۔ لیکن میں جانتا تھا دلوں سے رنجش دور نہیں ہوتی۔

مار کا رسیا

چار پانچ روز خیریت سے گزرے۔ ایک صبح کا ذکر ہے بلال شاہ میرے پاس بیٹھا تھا کہ اُس کا چودہ پندرہ سالہ لڑکا بھاگتا ہوا آیا۔ اُس نے بتایا کہ تھڑ والی جگہ پر کچھ آدمی اینٹیں لگا رہے ہیں۔ بلال شاہ تڑپ کر اٹھا اور میرے روکتے روکتے باہر نکل گیا۔ اُس کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ اتنے سال کی رفاقت کے بعد میں اُس کا مزاج اچھی طرح سمجھتا تھا۔ چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ بھولا بھی تھا۔ لڑائی جھگڑے کے معاملے میں آؤ تاؤ نہیں دیکھتا تھا۔ بس جہاں لڑائی ہو گئی، چاہے مقابلے میں اٹھ دس آدمی بھی ہوتے، بلال شاہ میدان جنگ میں کود پڑتا۔ یہی وجہ تھی کہ

ہفتے میں ایک آدھ بار کہیں نہ کہیں سے اُس کی سکتا ہی ہو جاتی تھی۔ لیکن مار کھانے کے بعد بھی وہ ٹکتا نہیں تھا۔ اور نہ ہی ڈرتا تھا۔ موقع پڑنے پر پھر حسب سابق تنہا مار کھانے کے لئے پہنچ جاتا تھا۔ بہر حال یہ تو چھوٹی موٹی لڑائیوں کی بات ہے اس وقت تک تو صورت حال خاصی تشویشناک تھی۔

میں نے فوراً موقع پر پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ جب میں بلال شاہ کے مکان کے سامنے پہنچا چند افراد ایک چارپاتی کندھوں پر اٹھائے بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ جب وہ قریب پہنچے تو میں نے اُن سے پوچھا چارپاتی پر کون ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بلال شاہ کو رجم بخش کے بیٹے نے خنجر مار دیا ہے۔ ایک لمحے کے لئے میرا داغ سن ہو گیا۔ بلال شاہ اور میرزا یادہ سے زیادہ تین منٹ کا وقفہ پڑا تھا۔ اتنی دیر میں کس قدر سنگین واقعہ رونما ہو گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ چارپاتی پر وہی بلال شاہ بے حس حرکت لیٹا ہے جو چند لمحے پہلے مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

لوگ چارپاتی لے کر بھاگتے ہوئے دور نکل گئے تھے۔ میں نے ایک ایسے آتی کو اُن کی مدد کے لئے بھیجا۔ بلال شاہ کی بیوی اور دونوں لڑکیاں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی سخت ڈپکار کر رہی تھیں۔ میں نے اُن کے پاس پہنچ کر دلاسا دیا۔ لوگوں نے بتایا کہ رجم بخش لڑکا اپنے ایک ساتھی کے ساتھ کھینٹوں کی طرف بھاگ گیا ہے۔ میں نے اے ایس آئی گوبندر کو ملزموں کے تعاقب میں بھیج دیا۔ بلال شاہ کے مکان کے ساتھ تھوکن نما جگہ پر چند اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ قریب ہی معمار کے اوزار پڑے تھے۔ لگتا تھا چند لمبے پہلے یہاں کچھ ہاتھ پائی ہوتی ہے۔ میں نے رجم بخش کے دروازے پر دستک دی۔ تیسری چوتھی دستک پر وہ باہر نکلا۔ اُس نے اس واقع سے لاعلمی کا

اظہار کیا۔ میں اُسے لے کر تھانے آ گیا۔

پندرہ منٹ کے اندر اندر رجم بخش کے آٹھ دس حمایتی تھانے میں پہنچ گئے۔ موقع کے گواہ بھی موجود تھے لیکن اُن میں سے زیادہ تر خاموش تھے۔ رجم بخش کے ایک حمایتی نے بتایا کہ گاؤں کے کچھ لوگ اپنے طور پر واپس اینٹیں لگا رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک جہوز بنا دیا جائے تاکہ لوگ اس جگہ پیشاب وغیرہ نہ کریں۔ اتنے میں بلال آ گیا اور اینٹیں لگانے والے کو مارنے لگا۔ جب اُس نے میاں رجم بخش اور اُن کے بیٹوں کو گالیاں دیں تو اُن کا بڑا بیٹا ہاشم آ گیا۔ بلال شاہ اور وہ گتھم گتھا ہو گئے۔ بلال شاہ نے چاقو نکال لیا۔ ہاشم نے خود کو بچانے کی کوشش کی۔ اسی کھینچا تانی میں چاقو بلال شاہ کو لگ گیا۔ یہ تو رجم بخش کے حمایتی کا بیان تھا۔ لیکن بلال شاہ کے حمایتی کا بیان کیا تھا۔ میں نے ادھر ادھر نظر گھمائی لیکن کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو تصویر کا دوسرا رخ دکھائے۔ ظاہر ہے رجم بخش کے اثر و رسوخ کی وجہ سے گاؤں کے کسی باشندے کو اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ بلال شاہ کے حق میں بولتا۔ بیوی بچوں کے علاوہ اُس کا کوئی رشتہ دار بھی نہیں تھا۔

بہر حال بیان کے بغیر بھی میں صورت حال کو سمجھ رہا تھا۔ رجم بخش نے اپنے کارندوں کے ذریعے جہوزے کا شاخسانہ چھڑا تھا اور ظاہر یہی کیا تھا کہ یہ گاؤں والوں کا کام ہے بعد میں اس کے بیٹے نے حمایتیوں کے ساتھ مل کر بلال شاہ کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ میں اس قسم کی صورت حال سے باہر گزر چکا تھا۔ دیہات کے چوہدری اور کھاتے پیتے لوگ اس طرح اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہیں کہ اُن کے جرم کے خلاف گواہی دھونڈنے میں پولیس والوں کو دانتوں پسینہ آ جاتا ہے۔

جب پردہ اٹھا...

بروقت طبی امداد ملنے سے بلال شاہ کی جان بچ گئی۔ کوئی بیس روز ہسپتال میں رہ کر وہ گاؤں واپس آ گیا۔ چوتھے کی تعمیر میں نے اسی دن رکوا دی تھی۔ بلال شاہ نے ہسپتال سے فارغ ہوتے ہی سختی شفعہ کا کس کر دیا۔ میں نے در پردہ اُس کی جائز مدد میں کوئی گناہ نہیں سمجھا۔ آثار بتاتے تھے کہ فیصلہ اُس کے حق میں ہو جائے گا۔ میرا گھر تھانے کے قریب ہی تھا۔ یہاں سے بلال شاہ کے گھر کا فاصلہ کوئی ایک فرلانگ تھا۔ ایک رات میری بیوی نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ ساتھ والی گلی سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے اپنے گھر میں ملازم کو صورت حال جاننے کے لئے بھیجا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ بلال شاہ کے ساتھ واپس آیا۔ بلال شاہ کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ کسی سے لڑ کر آیا ہے لیکن شاید میں یہ پہلی بار دیکھ رہا تھا کہ لڑائی کے باوجود اس کے زخمی ہونے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ وہ سینہ پھلا پھلا کر چل رہا تھا میں سمجھ گیا کہ لڑائی میں اُس کا پتہ بھاری رہا ہے۔ تفصیل بتاتے ہوئے بلال شاہ نے کہا۔

”آپ کو پتہ ہے جی میں بڑا چرکنا سوتا ہوں۔ ذرا کوئی آواز آتی اور میں جاگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دیوار کے پاس کسی چلا رہا ہو۔ میں دبے پاؤں چھت پر گیا تو ننگ والی زمین پر تین آدمی کھڑی کر رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ جیم دھوکے سے زمین پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ راتوں رات دیوار کھینچ کر اندر نئی دیوار گرا دیں گے اور پھر ”سٹے آرڈر“ لے کر بیٹھ جائیں گے، لیکن میں نے کوئی چوڑیاں تو نہیں پہن کیں۔ میں نے وہیں چھت کی منڈھیر سے دو ایمٹیں اکھاڑیں اور بلند

آواز سے کہا۔

اس کے بعد بلال شاہ نے واقعی اپنی آواز اتنی اونچی کر لی کہ ساتھ والے کمرے میں سوئے ہوئے میرے دونوں بچے ہڑپڑا کر اٹھ بیٹھے ہیں نے کہا ”اگر ماں کا دودھ پیا ہے تو اب کرو کھڑی“

اس کے بعد بلال شاہ نے ہاتھ چلا چلا کر اور آوازیں نکال نکال کر بتایا کہ کس طرح اُس نے اینٹیں پھینکیں اور کس طرح وہ ”چور کے پتر“ بھاگ گئے۔ بلال شاہ کی بات کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ جیم بخش زبردستی قبضہ کر کے ”سٹے آرڈر“ لینے کی کوشش کر سکتا ہے لیکن وہ اتنے کچے ہاتھ ڈالے گا اس کی مجھے اُمید نہیں تھی۔ اکیلے بلال شاہ کے لڑکار نے پر اُن کا بھاگ جانا عجیب سا لگتا ہے۔ ہو سکتا تھا جیم بخش تصادم سے بچنا چاہتا ہو لیکن کچھ بھی تھا یہ معاملہ تھا پراسرار۔ کچھ لوگ آدھی رات کے وقت متنازعہ زمین پر کھڑی کر رہے تھے۔ اُن کا کیا مقصد تھا۔ اگر وہ دیوار بنانا چاہتے تھے تو پھر بلال شاہ کی آمد پر بھاگ کیوں گئے؟ کیا اُن کا مقصد کچھ اور تھا؟ ہو سکتا ہے وہ کوئی چیز تلاش کر رہے ہوں۔ پھر اچانک میں نے ایک فیصلہ کیا۔ میں نے بلال شاہ نے کہا کہ مجھے ایک شک ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ایک روز کے لئے کہیں اور چلے جاؤ۔ وہ منہ پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا لیکن جلد ہی وہ میری بات سمجھ گیا۔

دو دن بعد بلال شاہ تمام گھروالوں کے ساتھ جالندھر میں کسی شادی کا بہانہ بنا کر چلا گیا۔ میں نے رات کے وقت ایک اسے ایس آئی کو متنازعہ جگہ کی نگرانی پر لگا دیا۔ میرا خیال تھا ہو سکتا ہے بلال شاہ کی غیر موجودگی میں وہ لوگ پھر کھڑائی کی کوشش کریں۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ شاید وہ لوگ چوکتے ہو گئے تھے۔ تقریباً ایک

اس واقع کی خبر جھگڑ کی آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ دُور دُور سے لاشیں دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ ناقابلِ برداشت بو کی وجہ سے لاشوں کے نزدیک جانا دشوار محسوس ہوتا تھا۔ بہر حال فرض کی ادائیگی میں سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے قریب جا کر لاشوں کا معائنہ کیا۔ جتنی رائے تو پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد ہی قائم کی جاسکتی تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ دونوں افراد کو خجروں کے وار کے ہلاک کیا گیا ہے۔ دونوں کے جسموں پر مقامی لباس یعنی دھوٹی گرتا موجود تھا۔ قاتلوں کی جلد بازی اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ دناتے وقت انہوں نے مقتولین کی جیبیں بھی خالی نہیں کی تھیں۔ ایک نوجوان کی جیب سے بگلا مار کے سگریٹ کا مڑا تڑپکیٹ اور تین روپے کی بریز گاری برآمد ہوئی جبکہ دوسرے کی جیب سے پندرہ روپے کے کرنسی نوٹ۔ ایک چھوٹی سی شیشی اور لوہے کا ایک ٹوٹا ہوا اسپرنگ نکلا۔ میں نے تمام چیزیں قبضے میں لے کر لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لئے امترسر روانہ کر دیا۔

کسی طرح قائم تھا۔ حالانکہ پابندی سے نماز نہیں پڑھتا تھا لیکن پکے نمازی بھی کسی دینی مسئلے پر اُس سے الجھ نہیں سکتے تھے۔ دراصل وہ مسجد کے انتظام اور مذہبی کاموں میں اتنے جوش و خروش سے حصہ لیتا تھا کہ لوگ تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اُس کے بیٹوں تک پہنچتے پہنچتے دینداری کا رنگ کافی پھیکا پڑ چکا تھا لیکن پھر بھی اُن میں کوئی ایسی بُرائی نہیں تھی جس کا ذکر خاص طور پر کیا جاسکے۔

لاشیں مل گئیں

اُس روز ابھی تھانے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ محرّر نے پوسٹ مارٹم کی ایک رپورٹ میرے سامنے رکھ دی۔ یہ کھلائی سے برآمد ہونے والی لاشوں کی رپورٹ تھی۔ رپورٹ کے مطابق دونوں نوجوانوں کی عمریں سترہ اٹھارہ سال کے درمیان تھیں۔ انہیں چالیس پندرہ سال قبل ہلاک کیا گیا تھا کسی تیز دھار آلے سے دونوں کے گلے کاٹ دیئے گئے تھے۔ جسم کے مختلف حصوں پر تشدد کے آثار بھی تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرنے سے قبل نوجوانوں نے جدوجہد کی ہے۔ ایک مقتول کے سر پر کسی دوزنی چیز لکڑی کی چو کو لٹھ یا اینٹ وغیرہ کی ضرب بھی لگائی گئی تھی۔

اینٹ کے لفظ پر میں چونک گیا۔ میرا دھیان غیر ارادی طور پر بلال شاہ کی طرف چلا گیا تھا۔ بلال شاہ کو ہم کبھی کبھی مذاق سے ”بلال اینٹ مار“ بھی کہا کرتے تھے۔ لڑائی بھڑائی میں اُس کا سب سے بڑا ہتھیار اینٹ ہوتی تھی۔ لڑائی کے دوران اینٹ کے حصول کے لئے وہ بعض اوقات ایک ایک فلائنگ دُور نکل جاتا تھا۔ لیکن یہ نہیں کہ اینٹ دستیاب ہوتے ہی وہ اُسے مد مقابل کے سر پر مارتا تھا۔ وہ

کے نیچے کیا گل بھلا ہوا ہے اس کے بیٹے نے کہا۔
خاں صاحب! بلال شاہ نے ہم پر بہتان باندھا کہ ہم اپنی ماں کے ذریعے اُس کی جگہ کو خاناقاہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایسی بے ہودہ بات کو ہم کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ یہ ہمارے لئے عزت اور وقار کا مسئلہ بن گیا۔ اگر ہم نے زمین حاصل کرنے کی کوشش کی تو صرف بلال شاہ کی ضد توڑنے کے لئے مگر وہ بھلے مانسوں کی طرح بات کرتا تو ہو سکتا تھا ہم یہ ٹھکرا اُسے دے دیتے۔

میں نے بڑے لڑکے ہاشو کو گھورا وہ ابھی تک گرم مُم بیٹھا تھا۔ میں نے اچانک سوال کیا۔ ”مُم اپنے ساتھیوں کے ساتھ آدھی رات کو زمین کھودنے آئے تھے کس لئے؟“
میری توقع کے برعکس ہاشو نے اس سوال کا جواب بڑے اعتماد سے دیا۔ اُس نے کہا ”خاں صاحب! ہم اس بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں کھدائی کرنے کون لوگ آئے تھے اور اُن کا ارادہ کیا تھا؟“

صورت حال کافی الجھی ہوئی تھی۔ ہاشو کی بات کافی حد تک درست تھی۔ بلال شاہ کو اس بات کا اعتراف تھا کہ وہ کھدائی کرنے والوں کی شکلیں نہیں دیکھ سکا تھا۔ اُس نے انہیں چھت پر سے لٹکا رہا تھا تو وہ اُس کے نیچے آتے آتے غائب ہو گئے تھے۔ کیا وہ کوئی تیسری پارٹی تھی؟

رجیم بخش اور اُس کے بیٹوں نے پوچھ گچھ کے دوران اپنی پوزیشن کسی حد تک صاف کر دی تھی۔ جہاں تک مجھے معلوم تھا رجیم بخش کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا۔ اُس کا باپ کسی وقت گاؤں کی مسجد کا امام ہوا کرتا تھا۔ رجیم بخش اپنے باپ کی طرح امامت کے منصب پر فائز تو نہیں ہوا تھا لیکن مسجد سے اُس کا تعلق کسی نہ

اس کا استعمال موقع محل کے مطابق کرتا تھا۔ بلال شاہ کے اس ”فن“ پر بات لمبی ہو جائے گی۔ میں ذکر کر رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کا۔ اینٹ کے لفظ نے میرے خیالات کا دھارا بلال شاہ کی طرف موڑ دیا۔

اگر رجم نحش پر شک کیا جاسکتا تھا تو انہی وجوہات کی بناء پر بلال شاہ کو بھی شکوک ٹھہرایا جاسکتا تھا۔ کیا بلال شاہ ایسا جرم کر سکتا ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ میرا جواب نفی میں تھا لیکن میرے اندر کا پولیس آفیسر مجھے اس معاملے میں مزید سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ پاگل عورت کے دیا جلانے اور لوگوں کی آمد و رفت پر بلال شاہ سخت پریشان ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس جگہ کو فوراً اپنے مکان میں شامل کرے۔ اُس کی بے صبری مجھے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ پھر مجھے یاد ہے چوترا بنانے کی خبر پر وہ کس طرح ٹرپ کر اٹھا تھا۔ میں اس کی تیزی پر خود حیران رہ گیا تھا۔ اُس کی غیر معمولی اعتیاد بھی اپنے اندر معنی رکھتی تھی۔ آدھی رات کے وقت جب کچھ افراد نے زمین کھودنے کی کوشش کی تھی۔ وہ فوراً باخبر ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا وہ کتنی دشواری سے ایک رات کے لئے کہیں جانے پر رضامند ہوا تھا۔ کچھ بھی تھا بلال شاہ کو بکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ پولیس کا خنجر تھامتا تھا۔ اُس کی بے شمار دُشمنیاں تھیں۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اے ایس آئی کو بندر کرے میں داخل ہوا۔ اُسے میں نے ہی بلایا تھا۔ میں نے اُسے دانتوں والی وائی کی شیشی دیتے ہوئے کہا۔

”اس پر“ فقیری منجن“ کا نام لکھا ہے۔ اگر پتہ بھی لکھا ہوتا تو ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ معلوم کرو فقیری منجن کون بنا رہا ہے اور کس جگہ

بنا رہا ہے“

اُس کے جانے کے بعد میں نے مقتول کی جیب سے برآمد ہونے والا اسپرنگ اٹھایا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ میرے قریب ہی ”رائفل من“ دلا اور بیٹھا تھا۔ اُس نے عام سے لمبے میں کہا نہ خاں صاحب یہ تو ۳۰۳ کا اسپرنگ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرے نے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔ مجھے یاد آگیا تھا کہ یہ اسپرنگ ۳۰۳ رائفل کی لمبی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایسے لگتا تھا کہ مقتول نے اپنی خراب رائفل کہیں بننے کے لئے دی تھی۔ رائفل بنانے والے نے خراب اسپرنگ نکال کر مقتول کو دے دیا تھا جو اُس نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ تفتیش کے لئے کچھ مواد ہاتھ آگیا تھا لیکن اگلا قدم اٹھانے سے پہلے مجھے گوبندر کا انتظار کرنا تھا۔

گوبندر اگلے روز شام کے وقت واپس آیا۔ وہ بُری طرح تھکا ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ فقیری منجن“ فیروز پور شہر کا ایک شخص بناتا ہے اور اُسے صرف فیروز پور بس اسٹاپ پر فروخت کیا جاتا ہے۔ گوبندر نے میری توقع سے بڑھ کر کام کیا تھا۔ اس نے ضلع فیروز پور کے تمام خٹانوں سے معلومات حاصل کی تھیں لیکن ڈیڑھ ماہ قبل ایک یا دو نوجوانوں کی گمشدگی کی رپورٹ کہیں درج نہیں کرائی گئی تھی۔ اب دو صورتیں ہو سکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ دونوں نوجوان جو ایک ہی گاؤں کے دکھائی دیتے تھے۔ فیروز پور کے باہر سے سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ یا پھر دونوں اپنے لواحقین کو بنا کر آئے تھے کہ وہ طویل عرصے تک گھر سے باہر رہیں گے۔ بہر حال تفتیش کا راستہ مسدود نہیں ہوا تھا۔ میں نے گوبندر کو ایک بار پھر فیروز پور بھیجے کا فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ فیروز پور شہر میں بندوئیں وغیرہ ٹھیک کرنے کی تین چار دوکانیں ہوں گی۔ ارد گرد کے قصبوں

میں بھی ایک ایک دو دو دکانیں ہوں گی۔

گویندر اگلے روز روانہ ہو گیا۔ اس دفعہ وہ تین روز کے بعد واپس آیا۔ میں اُس وقت بلال شاہ کے ساتھ دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ بلال شاہ چونکہ مشتبه افراد کی فرست میں شامل تھا۔ اس لئے میں نے گویندر کو آنکھ کے اشارے سے بات کرنے سے روک دیا۔ بلال شاہ نے شاید اس بات کو نوٹ کر لیا وہ اُسی وقت اُٹھا اور لمبے لمبے دُک بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ گویندر کے چہرے پر کامیابی کی جھلک نظر آرہی تھی۔ اُس نے خوشخبری سنائی کہ مقتول نوجوان کا سراغ مل گیا ہے۔ وہ دونوں گنڈا سنگھ والا کے ایک فوجی گاہک شاہ پور کے رہنے والے ہیں۔ گویندر نے بتایا۔

”کل میں اسلئے کے کاریگروں کا سراغ لگاتا ہوا گنڈا سنگھ والا پہنچا۔ یہاں اس کام کی ایک مشہور دکان ہے۔ دکان کا مالک محمد علی نامی ایک شخص ہے۔ میں نے اُسے اسپرنگ دکھا کر بندوق کے بارے میں پوچھا۔ وہ اس پرزے کو اچھی طرح جاننا تھا۔ ڈیڑھ ماہ پہلے اُس نے اپنے اکلوتے لڑکے ظفر کو یہ اسپرنگ لے کر فیروز پور بھیجا تھا تاکہ وہ اس طرح کا نیا اسپرنگ لے آئے۔ وہ سارا دن انتظار کرتا رہا لیکن نہ تو لڑکا آیا اور نہ اسپرنگ۔ دوسرے روز پتہ چلا کہ ظفر کا ایک انتہائی قریبی دوست بھی گھر سے غائب ہے۔ اُس کا نام عنایت تھا۔ اور وہ فریہنچر کا کام کرتا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے دونوں دوست کسی دوسرے شہر جا کر کام کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ دراصل ظفر کا دل اپنے باپ کے کام میں نہیں لگتا تھا۔ یوں بھی کوئی ایک ماہ سے وہ سخت پریشان رہتا تھا۔ ایک دو بار اپنے باپ سے اُس کی جھڑپ بھی ہوتی تھی۔ جب تین چار روز گزرنے کے باوجود دونوں دوست واپس نہیں آئے تو گھروالوں نے سمجھ لیا کہ وہ کسی دوسرے شہر کام کرنے چلے گئے ہیں۔“

گویندر نے بتایا کہ اُس نے ابھی تک لڑکوں کے والدین کو اس حادثے کی اطلاع نہیں دی۔ بہر حال اُس نے انہیں یہ کہہ دیا تھا کہ یہاں آکر انہیں بیٹے کے بارے میں اہم اطلاع مل سکتی ہے۔ اب وہ لوگ شام کی گاڑی سے امرتسر پہنچ رہے تھے۔ غم زدہ والدین کو لڑکوں کی موت کی اطلاع دینا ایک انتہائی ناخوشگوار فریضہ تھا جو میں نے انجام دیا۔ ظفر کے والد کے ساتھ ساتھ اُس کی ماں بھی آتی تھی اُس کی دلخراش چیخوں نے ہر آنکھ کو اشکبار کر دیا۔ لڑکوں کو امانت کے طور پر مقامی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ قبریں کھود کر لاشیں والدین کے حوالے کر دی گئیں۔ اور وہ روتے پٹتے گنڈا سنگھ والا واپس چلے گئے۔ تنہیز و تکفین میں دو دن لگنا ضروری تھے۔ تیسرے دن میں اے ایس آئی گویندر کے ساتھ شاہ پور جا پہنچا۔

عورت کا اسرار

اب ہمیں اس بات کا سراغ لگانا تھا کہ دونوں بد نصیب دوست شاہ پور گاؤں سے فیروز پور اور پھر امرتسر سے ہوتے ہوئے ”رام پور“ کیسے پہنچ گئے۔ ابتدائی تعقیب کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ نہ تو رام پورے میں اُن کی کوئی رشتہ دار تھی اور نہ ہی یاری دوستی۔ یہ بھی امکان نہیں تھا کہ وہ کام کاج کے سلسلے میں وہاں گئے ہوں گے۔ میں نے تین دن وہاں رُک کر تعقیب کی۔ مقتولین کے دوستوں سے ملا۔ اُن کی ذاتی چیزیں دیکھیں۔ ماضی کے بارے میں پچھان بین کی، لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ صرف اس بات کا اندازہ ہوا کہ دونوں انتہائی گھرے دوست تھے اور دوسرے ہم عمروں سے زیادہ میل جول نہیں رکھتے تھے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ انہیں اغوا کر کے رام پور سے پہنچایا

گیا ہو لیکن پھر میرا دھیان اُن کی جلیوں سے برآمد ہونے والی اشیاء کی طرف چلا گیا۔ یقیناً یہ اغوار کا کیس نہیں تھا۔ لڑکے اپنی مرضی سے رام پورہ آئے تھے اور بعد میں جو کچھ بھی ہوا تھا بڑی جلدی میں ہوا تھا۔

میں مقتول ظفر کے گھر کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا لیکن دکان دیکھنی باقی تھی میں نے اُس کے والد سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ وہ مجھے گنڈا سنگھ والا کے بازار میں اپنی دکان پر لے گیا۔ دکان میں بندو قوں کے ٹوٹے پھوٹے دستے بے کار پستول، لوہے کی رنگ آمودنیاں اور نجانے کیا کچھ پڑا تھا۔ ایک میز کے پیچھے کرسی رکھی تھی۔ کرسی کے ساتھ ہی رقم رکھنے والا چھوٹا سیف پڑا تھا۔ میں ایک ایک چپکے باندھو معائنہ کر رہا تھا۔ کرسی کے پیچھے دیوار کے ساتھ چکنائی کا ایک بڑا سا دھبہ تھا۔ کرسی پر بیٹھنے والے کا سر مسلسل دیوار کے ساتھ گٹنے سے یہ دھبہ بنا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا ایک دوسرا چھوٹا دھبہ جو نسبتاً کم بلندی پر تھا۔ دائیں طرف نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ مقتول لڑکے کے سر کا دھبہ ہے۔ اس وجہ سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ دکان پر بیٹھتے وقت کرسی کو اصل جگہ سے دو فٹ دائیں جانب کھسکا لیتا تھا۔ بظاہر یہ ایک معمولی بات تھی لیکن میں کوئی گوشہ تاریک چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لڑکے کا باپ محمد علی مجھے بیٹھنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ میں نے کرسی کو دو فٹ دائیں طرف کھسکا یا اور بیٹھ گیا۔ یہاں سے میں نے دیکھا کہ دکان کے کونے سے ایک دو منزلہ مکان کی جھلک صاف دکھائی دینے لگی تھی۔

چھت پر خوبصورت جالی دار پردہ لگا تھا اور ایک عورت پردے پر جھکی ہوئی دکان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب اُس نے مجھے اپنی جانب دیکھتے پایا تو ٹھٹھک کر پیچھے ہٹ گئی۔ جالی میں سے اس کا ہیولا صاف نظر آ رہا تھا وہ ابھی تک چھت پر کھڑی

تھی۔ پھر وہ شاید نیچے اتر گئی۔ میں محمد علی سے باتیں کر رہا تھا۔ لیکن میری نگاہیں تیزی سے مکان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دوسری منزل کی ایک کھڑکی میں پیدا ہونے والی در ز میری نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکی۔ کوئی بڑی احتیاط سے دکان کا جائزہ لے رہا تھا۔۔۔۔۔ میں نے وہاں کے میکینوں سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں نے ایس آئی گو بندر کے ساتھ مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ وہی چھت والی عورت باہر نکلی اور میری وردی کی جھلک دیکھ کر زرد ہو گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں بالکل دیر نہ لگی کہ وہ رحیم بخش کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ چالیس پندرہ سال کی عمر میں بھی صحت مند اور خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ یہ ایک لمبا قصہ ہے کہ میں نے کس طرح اُسے اعتماد میں لیا۔ بہر حال دو گھنٹے کے اندر اندر اُس نے سب کچھ اگل دیا۔ اُس نے بتایا کہ رحیم بخش اُس کی چھوٹی بہن کا خاوند ہے۔ وہ شروع ہی سے بڑا سخت مزاج ہے۔ خاندان کے تمام لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ اُس نے بھی صرف اُسی کے خوف سے اب تک اپنی زبان بند رکھی ہے۔ اُس نے کہانیوں بیان کی۔

”قریباً چار ماہ پہلے رحیم بخش کی بڑی لڑکی فرخندہ میرے پاس رہنے کے لئے آئی۔ وہ یہاں کوئی ڈیڑھ مہینہ رہی۔ اسی دوران سڑک پار کی دکان پر بیٹھنے والے لڑکے سے اُس کی راہ رسم ہو گئی۔

میں تو یہ کہوں گی کہ یہ سب رحیم بخش کی بے جا سختیوں کا نتیجہ تھا جو وہ اپنے بال بچوں پر کرتا آیا ہے۔ میں نے فرخندہ کو بہت سمجھایا کہ تیرا باپ بڑا سخت ہے وہ تجھے اس غلطی پر کبھی معاف نہیں کرے گا لیکن اُس بد نصیب کی قسمت میں شاید یہی کچھ

انہیں جان سے نہ مارے لیکن اُس پر تو خون سوار تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ بھاگ جاتے ورنہ وہ اُسے بھی مار دیں گے لیکن اُس بد نصیب کی قسمت میں یہی لکھا تھا، عورت پھر ایک آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔ میں اور گو بندر ہمہ تن گوش تھے۔

”پھر کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

عورت نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: ”فرزندہ نے باپ کی بندوق تھام لی اور کہا مجھے گولی مار دو۔ لیکن وہ سنگدل بولا، حرام زادی میں تیری ہڈیاں توڑ کر تجھے ماروں گا۔ اُس نے بندوق کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ میں آگے بڑھی لیکن دوسرا دستہ میرے سر پر پڑا۔ میں نے دھندلاتی ہوتی نظروں سے دیکھا۔ ریحیم بخش کے تینوں نوکر لڑکوں کو دوپچے ہوئے اُن کے گلے پر خنجر پھیر رہے تھے۔ اور ریحیم بخش اپنی بیٹی پر بندوق کے دستے برسا رہا تھا اس کے بعد میں بے ہوش ہو گئی۔“

مجھے دوسرے دن ہوش آیا۔ میں وہیں ایک کمرے میں ستر پر لیٹی تھی اور سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ریحیم بخش مراٹے کھڑا لال آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی آنکھیں تھیں جنہیں میں بچپن سے دیکھتی آتی تھی۔ اور جنہیں دیکھ کر میرا خون خشک ہو جاتا تھا۔ ریحیم بخش نے پھنکارتے ہوئے کہا اگر زبان سے ایک لفظ بھی نکالا تو مجھڑے کر دوں گا۔ میں نے چُپ سا دھلی۔ محلے کی عورتیں زمین پر بیٹھی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے بتایا گیا کہ مجھے بتایا گیا کہ فرزندہ آگ میں مجلس گرفت ہو گئی ہے۔ کل تندو میں روٹیاں پکاتے ہوئے اُس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔ مجھے سب معلوم تھا۔ لیکن میں رو جلا کر چُپ ہو رہی اپنی پاگل بہن کی طرح جو گم غم بیٹھی تھی۔ مجھے پتہ نہیں تھا اُن لڑکوں کے ساتھ کیا بیٹی اور انہیں کہاں غائب کیا گیا۔ نہ ہی مجھے اتنی ہمت ہوئی کہ میں ریحیم بخش

تھا۔ وہ باز نہیں آتی۔ ایک دن ریحیم بخش یہاں آیا تو اُسے شک ہو گیا۔ اُس نے مجھے سخت برا بھلا کہا اور لڑکی کو فوراً یہاں سے لے گیا۔ میرا خیال تھا کہ معاملہ ختم ہو جاتے گا۔ لیکن وہ لڑکا کھوج لگا کر رام پورے پہنچ گیا۔ فرزندہ اُس سے چوری چُپے کھیتوں میں ملی۔ گاؤں کے ایک شخص نے اُنہیں دیکھ لیا اور اُس کی خبر ریحیم بخش کو دے دی۔ اُس نے لڑکی کو بے دردی سے مارا۔ جب مجھے اس کا پتہ چلا تو میں رام پورے گئی۔ میں فرزندہ سے بھی ملی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ معاملہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ لڑکی نا سمجھ تھی یہی کوئی سولہ سال کی ہو گی۔ وہ کبھی تھی جان دے دے گی لیکن ظفر کے بسو اسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ اگر یہ شادی ہو جاتی تو کوئی بُرائی بھی نہیں تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ ریحیم بخش یہ بات بھی سنا گوارا نہیں کرے گا۔ سمجھ لاری یہی تھی کہ لڑکی کی فوراً کہیں شادی کر دی جائے۔ ہم نے ایک جگہ بات چیتی کی اور شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ شادی سے کوئی بیس دن پہلے ظفر اپنے دوست کے ساتھ پھر رام پور پہنچ گیا۔ فرزندہ کو ایک کمرے میں بند رکھا گیا تھا اور ریحیم بخش باہر چار پائی ڈال کر سویا ہوا تھا۔ آہٹ سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دروازہ کھولا تو ظفر و شندان کے رستے کمرے میں اتر چکا تھا۔ دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر ریحیم آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے اپنے تین خاص نوکروں کو کسی ایسے ہی واقعے کے لئے حویلی کے اندر سُلا رکھا تھا۔ اُس نے آواز دی اور تینوں آدمی لاٹھیاں لے کر آگئے۔ شور سن کر ظفر کا ساتھی بھی اندر آ گیا تھا۔ میں اُس دن وہیں تھی۔ قتل و غارت کا وہ منظر مجھے ساری زندگی نہیں بھولے گا۔ دونوں لڑکوں نے معمولی مزاحمت کی، یوں بھی ابھی وہ بچے ہی تھے۔ میں نے ریحیم بخش کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ

سے اس بارے میں پوچھوں۔ چند روز پہلے جب مجھے پتہ چلا کہ رحیم بخش کے مکان کے پاس سے دو لڑکوں کی لاشیں ملی ہیں تو میں سمجھ گئی۔ یہ وہی بد نصیب دوست ہیں عورت چھڑانکھوں پر دو پتھر رکھ کر پھکیاں لینے لگی۔

اور وہ پکڑا گیا

میں جب رحیم بخش کو گرفتار کرنے کے لئے اُس کے گھر پہنچا، اندر سے اُس کی آواز آرہی تھی۔ شاید وہ کسی کو بیٹ رہا تھا تب دروازہ کھلا اور نوؤس سال کی ایک بچی چیختی ہوئی باہر بھاگی۔ رحیم بخش ہاتھ میں جوتا لئے اُس کے پیچھے نمودار ہوا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے پک رہے تھے بڑھے دیکھ کر دھڑک گیا۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے رکھا تھا کھیل ختم ہو گیا، رحیم بخش اپنے قدموں کو روک لو، تم تو مذہب کے ٹھیکیدار بنتے تھے رحیم۔ مجھے نہیں معلوم تھا تم مذہب سے اتنے دور ہو، میری آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ ”مُحَمَّدؐ اور رسولؐ نے بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کا حکم نہیں دیا لیکن تم ایسا کرتے ہو۔ اُن کو کنوؤں میں دھکے دیتے ہو اور کہتے ہو پاؤں پھسل گیا۔ اُن پر فائر کرتے ہو اور کہتے ہو بدوق صاف کرتے ہوئے آگ لگ گئی۔ میں نہیں گرفتار کرتا ہوں رحیم بخش“

رحیم بخش کا رنگ بالکل سفید پڑ گیا۔ جوتی اُس کے ہاتھ سے گر گئی۔ میرا بہت کچھ بولنے کو دل چاہتا تھا لیکن خود پر ضبط کیا۔ پستول کا ٹھوکا دیتے ہوئے میں نے اُسے دروازے کی طرف دھکیلا۔ اے ایس آئی گو بندر اُس کے دونوں بیٹوں کو گرفتار کر چکا تھا۔ تھانے کے دروازے کے عین سامنے پہنچ کر رحیم بخش بُری

طرح ڈنگایا۔ میں نے اُسے سہارا دیا۔ اُس کی آنکھیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ اُسے دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ ہسپتال پہنچنے سے پہلے پہلے وہ دم توڑ گیا۔ ایک لحاظ سے اُس کے حق میں اچھا ہی ہوا۔ وہ چھانسی پانے کی ولت سے بچ گیا۔ اُس کا بڑا بیٹا قصو وار پایا گیا اور کوئی ڈیڑھ سال بعد تختہ دار پر لٹک گیا۔ رحیم بخش کے ایک نوکر کو بھی موت کی سزا ہو گئی۔

اس کیس کی ایک دلچسپ بات بلال شاہ کا روٹھنا تھا۔ اُسے اس بات کا سخت دکھ ہوا تھا کہ میں نے اُس کی موجودگی میں گو بندر سنگھ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اُس پر شک کیا تھا۔ وہ بیوی سے لڑنے کے شعلے چلا گیا۔ اُس کی بیوی مجھ سے پیسے لے لے کر گھر کا خرچ چلاتی رہی۔ بالآخر میں نے گو بندر سنگھ کو بھیجا۔ اُس نے ایک کامیاب ”چھلپ“ مار کر اُسے شعلے کی مال روڈ سے پکڑ لیا۔ وہ وہاں خشک خرمائیاں اور کاغذی بادام بیچ رہا تھا۔

سنہرے خواب

برساتی نالے میں پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ بلال شاہ ابھی چار پانچ قدم ہی اندر گیا تھا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا۔ ہمارے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ لیکن پھر خوش قسمتی سے وہ سنبھل گیا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ دونوں سپاہی زور زور سے ہنسنے لگے۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اُس نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ نالے کو باسانی پار کیا جاسکتا ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ سپاہی محمد حسین اُس کی باتوں میں آکر گھوڑا پانی میں ڈال دے گا۔ لیکن وہ بھی ایک کلیاں تھا۔ اُس نے کہا تھا شاہ صاحب آپ تو اس علاقے کے کیرے ہیں۔ یہاں کی اونچ نیچ سے آپ سے زیادہ واقف کون ہو گا۔ بلال شاہ جوش میں آکر گھوڑے سے اتر اٹھا لیکن نالے میں اترتے ہی اُسے ہوش آگئی تھی۔ اب وہ بڑے اطمینان سے گھاس پر بیٹھا اپنی جوتی میں سے پانی نکال رہا تھا۔ میرے ساتھ دونوں سپاہی بھی گھوڑوں سے اتر آئے تھے۔ گھوڑوں کو نزدیک درخت سے باندھ کر وہ بلال شاہ کے پاس جا بیٹھے۔ میں نے بوٹ اور پیٹی کھول دی اور ایک درخت سے ٹیک لگا کر آرام کرنے لگا۔

کل صبح اترتے سے ایک قاصد کے ہاتھ میں پی صاحب نے مجھے خط بھیجا تھا۔

اس خط میں انہوں نے علاقے کے ایک با اثر جاگیردار چوہدری سنگرام کی کچھ مشکلات بیان کی تھیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ بوٹا سنگھ نام کا ایک مغرور جگر دار کی اکلوتی لڑکی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ اُسے دوبار اٹھانے کی کوشش کر چکا ہے تا حال وہ اُن لوگوں کو دھمکیاں دے رہا ہے۔ چوہدری سنگرام ایس پی کا دوست تھا۔ اس لئے ایس پی صاحب نے خاص طور پر مجھے جاگیردار کے ہاں بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا: "نواز خاں: میری نظر میں اس کام کے لئے تم سے بہتر کوئی آدمی نہیں مجھے معلوم ہے تمہارے جلنے سے کچھ عرصے کے لئے رام پورہ تھانے کی کارکردگی پر اثر پڑے گا لیکن جو کام میں تمہیں سونپ رہا ہوں یہ بھی بہت اہم ہے۔ تم اپنے ساتھ دس پندرہ یا جتنے بھی آدمی چاہو لے جا سکتے ہو لیکن جاگیردار کی کوئی تشکایت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر بوٹا سنگھ حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو اُسے بچ کر نہیں جانا چاہیے۔"

میں نے جب تھپاکر خط کی موجودگی کا اندازہ لگایا، ایک نظر نالے کی طرف دیکھا اور آنکھیں میچ کر لپیٹ گیا۔ مجھے معلوم تھا دو تین گھنٹے سے پیشتر نالہ ہمیں اپنے اندر سے گزرنے کی اجازت نہیں دے گا۔

جب میں اٹھا گھڑی تین بجے کا وقت دکھا رہی تھی۔ میں اپنے اندازے کے عین مطابق ڈھائی گھنٹے سو با تھا۔ دونوں سپاہی اور بلال شاہ ابھی تک بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ میں نے نالے کی طرف دیکھا۔ پانی کافی حد تک اتر چکا تھا لیکن بادل جو بارش رکنے کے بعد چھٹ گئے تھے اب پھر گھر گھر آنے لگے تھے۔ میں نے بلال شاہ اور دونوں سپاہیوں کو جگایا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نالہ پار کر کے گھوڑے بھگاتے ہوئے جاگیردار کے گاؤں "روپ نگر" کے راستے پر جا رہے تھے۔ ایس پی صاحب

کے خط کے مطابق آج رات پھر بوٹا سنگھ کی آمد کا خطرہ تھا۔ مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں شام سے پہلے روپ نگر پہنچ جاؤں۔ ہم نے کافی کوشش کی لیکن روپ نگر سے کوئی دس کوس ادھر ہی ہمیں اندھیرا پڑ گیا۔ جس وقت ہم روپ نگر پہنچے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بارش اور کچھ لکی وجہ سے ہمارا اور گھوڑوں کا برا حال تھا۔ جاگیردار کی بلند بالا حویلی کے سامنے چند افراد ملے۔ اُن کے ہاتھوں میں بندو قیں اور برچھیاں تھیں اور وہ تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں کچھ ہو چکا ہے ہم نے ایک آدمی کے ہاتھ اندر اطلاع بھجوائی۔ تھوڑی دیر بعد ایک لمبا ترنگا شخص باہر نکلا۔ عمر کوئی پچیس چھیس سال کی ہوگی۔

"آؤ بادشاہو" اُس نے مجھے دیکھ کر مصانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بڑی دیر کی مہربان آتے آتے۔"

وہ جیلے سے دیہاتی لیکن لب و لہجہ سے پڑھا لکھا شخص دکھائی دیتا تھا۔ ہمیں ساتھ لے کر وہ حویلی میں داخل ہوا۔ حویلی کے در و دیوار جاگیردار کی امارت کی گواہی دے رہے تھے۔ میں نے اتنے ٹھاٹھ باٹھ کی بہت کم حویلیاں دیکھی ہیں۔ ہمیں لے کر وہ لوہان ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں صوفوں کے اوپر کسی آدمی بیٹھے تھے۔ فرش پر تہمتی تالین پچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر بندو قیں کھڑیاں وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔ جھگی جانوروں کے حوط شدہ سر بھی نظر آ رہے تھے۔ سامنے دیوار پر شاید کسی چیتے کی کھال آویزاں تھی۔ اس کھال کے عین میچے مڑین کرسی پر جاگیردار سنگرام بیٹھا تھا۔ وہ آدمی اُس کے قدموں میں بیٹھے تھے۔ ایک کالا بھنگ پلوان ناشتہ اُس کے پیچھے برجھی تھامے تو دب کھڑا تھا۔ دونوں سپاہی اور بلال شاہ باہر ٹھہر گئے تھے۔ میں اندر داخل ہوا۔ میرے

ساتھ آنے والا نوجوان میرے بوٹوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بوٹ کچڑ میں لٹھڑے ہوتے تھے۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ شاید مجھے بوٹ اتارنے کے لئے کہہ رہا تھا میں نے تسموں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ جاگیردار کرسی سے اٹھ کر تیزی سے میری طرف بڑھا۔ ”کیا کرتے ہو جناب“ اُس نے خوشدلی سے میرا بازو تھامتے ہوئے کہا ”مقام تو ہمارے حاکم ہو۔ کھلے دل سے اندر آؤ“

اس نے گرجو شئی سے مصافحہ کیا اور مجھے صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے جاگیردار سے صورت حال کے بارے میں پوچھا۔ وہی لمبا ترنگا نوجوان پھر بولا۔

”آپ بالکل وقت پر آئے ہیں جناب۔ ڈاکوؤں کو بھگا دیا ہے ہم نے۔۔۔۔۔ آپ کے لئے ہم نے صلوہ تیار کر کے رکھا ہوا ہے۔ آپ صلوہ کھائیں اور آرام سے سو جائیں“

اُس کے لہجے کا طنز اتنا نمایاں تھا کہ کمرے میں موجود کئی افراد مسکرانے لگے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں ایسا جواب دیتا کہ صاحب بہادر کے ہوش ٹھکانے آجاتے لیکن اُس وقت میں صبر کے گھونٹ پی گیا۔ میں نے جاگیردار کو بتایا کہ راستے میں ڈیک نالے کی طغیانی کی وجہ سے ہم وقت پر نہ پہنچ سکے۔ جاگیردار سنگرام ایک بھلا شخص دکھائی دیتا تھا۔ اتنی بڑی جاگیر کا مالک ہونے کے باوجود اس میں نخوت اور خڑہ نہیں تھا۔ اُس نے میرا نام پوچھا اور پھر ”نواز“ کہہ کر باتیں کرتا رہا۔ اُس نے بتایا کہ کوئی ایک گھنٹہ پہلے ڈاکوؤں نے دھکی کے مطابق گاؤں پر حملہ کیا تھا لیکن ہم نے انہیں گاؤں کے باہر ہی سے مار بھگایا۔ ایک دیہاتی گولی لگنے سے معمولی زخمی ہوا تھا۔

اگلے روز میں نے جاگیردار سے اکیلے میں بات کی۔ اُس نے بتایا کہ بوٹا سنگھ کا قصہ چند ماہ پرانا ہے۔ ایک روز اُس کی لڑکی جمناسیلیوں کے ساتھ باغ میں گئی تو وہاں سے بوٹا اپنے ساتھیوں کے ساتھ گزرا۔ انہوں نے لڑکیوں سے بدتمیزی کی تو جمنے انہیں بڑا بھلا کہا۔ بوٹا سنگھ نے بدزبانی کی اور جمنے اُسے تھپتھپکھنچ مارا۔ اتنے میں گاؤں کے آدمی پہنچ گئے اور بوٹا ساتھیوں کے ساتھ فرار ہو گیا۔ جاگیردار ایک باپ کے انداز سے بنا رہا تھا اور میں ایک پولیس والے کے انداز سے سوچ رہا تھا۔ بوٹا سنگھ لڑکی کا حسن دیکھ کر اُس پر عاشق ہو گیا ہوگا۔ اُس نے اُسے اٹھانے کی کوشش کی ہوگی لیکن کامیاب نہیں ہوا ہوگا۔ بہر حال کچھ بھی تھا مجھے جاگیردار سنگرام کی حویلی کی حفاظت کا فرض سونپا گیا تھا اور یہ فرض مجھے ہر قیمت پر ادا کرنا تھا۔ میں نے جاگیردار کی اجازت سے حویلی کے اندرونی حصوں کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ حویلی کی عمارت دو منزلہ تھی۔ کمرے بڑے بڑے تھے۔ اُن کی آرائش سے اندازہ ہوتا تھا کہ حویلی کے مکین زیادہ نہیں تو کچھ پڑھے لکھے ضرور ہیں۔ خاص طور پر جاگیردار کا کمرہ بالکل شہری انداز سے سجا ہوا تھا۔ اُس کے پلنگ کے پاس چند کتابیں بھی دھری تھیں۔ عمارت کے عقب میں چار دیواری کے اندر زمین کا ایک کافی بڑا قطعہ خالی پڑا تھا۔ شاید مکینوں کی خواہش یہاں تالاب وغیرہ بنانے کی ہو لیکن پھر اتنے ”ماڈرن پن“ کی انہیں ہمت نہ ہوتی ہو۔ باتیں طرف ایک قطار میں ملازموں کی کوٹھڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ عمارت کے سامنے والے حصے میں ایک چھوٹا سا مندر اور مندر کے ساتھ ایک باغ تھا۔ اس کے بعد میں نے حویلی کے محل وقوع کا جائزہ لیا۔ بیرونی حد بندی دیکھی اور اپنے دونوں راضل بردار سپاہیوں کو نگرانی پر لگا دیا۔

دو تین دن گزر گئے کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ اپنے لئے میں نے حویلی کا سامنے والا حصہ منتخب کیا تھا۔ حویلی کے گیٹ کے قریب ہی میرے لئے کمرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں کمرے کے باہر کرسی ڈلو کر بیٹھ جاتا اور بلال شاہ سے گپ شپ لڑاتا رہتا۔ بلال شاہ غالباً کہہ لیجئے کہ ”ریلوگٹا“ تھا۔ کبھی وہ میرے پاس آ بیٹھتا اور کبھی سپاہیوں کی طرف چلا جاتا۔ ایک روز شام کے وقت وہ میرے پاس آیا تو کہنے لگا۔

”خان صاحب! اُدھر باتیں نہ کرو میں کچھ گڑبڑ ہے۔ محمد حسین کا خیال ہے کوئی آدمی باغ میں چھپا ہوا ہے۔“

میں نے بلال شاہ کو واپس بھیج دیا اور خود چل قدمی کے انداز میں چلتا ہوا باغ کی طرف گیا۔ شام ہو چکی تھی اور آہستہ آہستہ اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ ایک ٹوکرائی سر پر ایک بڑا تھال رکھے حویلی کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ شاید تندور سے روٹیاں گوا کر آئی تھی۔ میں اُسے نظر انداز کرتا ہوا باغ میں داخل ہو گیا۔ باغ میں اندھیرا زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ مالٹے اور سنگترے کے پودوں میں سے گزرتا ہوا میں مندر کی جانب گیا۔ ایک جگہ پتھر کے پنج پر وہی لمبا ترنگا نوجوان بیٹھا تھا۔ اب میں اس کے بارے میں اچھی طرح جان چکا تھا۔ اس کا نام منوج تھا۔ یہ جاگیر دار کا بھتیجا تھا۔ تھوڑا بہت پڑھا ہوا بھی تھا۔ جاگیر دار کے ہاں اس کا کافی آنا جانا تھا لیکن اس وقت وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ لڑکی کی عمر بیس بائیس سال کی ہو گی۔ اُس نے کڑھائی والا لیشمی لاجا اور قمیض پہن رکھی تھی گلے میں ہار اور ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں نظر آرہی تھیں۔ اُسے دیکھتے ہی میری نظر سب سے پہلے اُس کی ناک پر اکھ گئی۔ اُس نے ناک میں بڑی خوبصورت

نکھتی پہن رکھی تھی۔ مجموعی طور پر لڑکی خوبصورت تھی۔ میں اُسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ جاگیر دار کی بیٹی جمنی تھی۔ اسی پر بولنا سنگھ عاشق ہوا تھا۔ میں نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

”منوج باؤ! یہ آپ ہیں؟ میں نے سمجھا پتہ نہیں کون ہے۔“

میں واپسی کے لئے مڑا۔ اتنے میں منوج کی آواز آئی ”بادشاہو! اپنے کام سے کام رکھو۔ آپ کی ڈیوٹی رات کو ہے۔ رات کو سونے سے بہتر ہے کہ دن میں سو لیا کریں۔“ مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔ لڑکی کی موجودگی میں سخت بات کہنی میں نے مناسب نہیں سمجھی۔

”بادشمنوج، میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ مجھے جو ذمہ داری لگائی گئی ہے اُس میں رات اور دن کی شرط نہیں ہے۔“

”ذمے داری کیا ذمے داری؟“ منوج آگ بگولا ہو گیا۔ لڑکی بھی کڑی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم لوگ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ہمیں تنہا ہی سرکاری بندوٹوں کی ضرورت نہیں۔ پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا ”جمنی! تیا جان نے خواہ مخواہ کا خرچہ کیا ہے۔ ان لوگوں پر۔ کائے کے ہاتھوں نے بھی کبھی کسی کی حفاظت کی ہے۔“

”صاحب بہادر تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

اتنے میں جمنی بڑے ناز و انداز سے اُٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب آگئی۔ تنگ قمیض میں اُس کا بدن پھٹ پڑنے کو بے قرار تھا۔ میرے سامنے پہنچ کر اُس نے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے۔ نصف آستین میں اس کے خمیدہ بازو بڑے پرکشش دکھائی دے رہے تھے۔ اب اس کی آنکھوں میں تلخی کی جگہ شوخی نظر آرہی تھی۔ بڑی ملائمت سے بولی۔

”جناب تھانیدار صاحب! لڑائی جھگڑا چھوڑ دیں۔ ادھر ذرا روشنی میں بیٹھ کر اپنی پستول صاف کر لیں۔ میں نے سنا ہے اکثر عین موقع پر آپ لوگوں کی بندھنیں فیل ہو جاتی ہیں۔ اور ہاں، ذرا گیسٹ کا دھیان رکھئے گا۔ میری سہیلیاں بلانے آئیں تو مجھے بتا دیں۔“

میں نے جبرے بھینچ کر اپنے غصے کو قابو میں کیا اور لڑکی کو دیکھتا ہوا واپس مڑ گیا۔ میری توقع کے مطابق وہ دونوں میرے پیچھے ہنسنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ان لوگوں کا پالانہ جانے کیسے پولیس افسروں سے پڑتا رہا تھا۔ مالک تو مالک گھر کے ملازمین بھی پولیس والوں کو فالتوسی چیز سمجھتے تھے۔ پہلے منوج اور اب لڑکی کے رویے سے مجھے سخت مایوسی ہوتی تھی۔ اس قسم کی باتیں سن کر پی جانا میری سرشت میں نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی جو میں اب تک خاموش تھا۔ بہر حال میں نے جاگیر دار سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ملازم کے ہاتھ پیغام بھیجا۔ جاگیر دار نے تھوڑی دیر بعد مجھے اندر بلا لیا۔ میں نے جاگیر دار سے دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ انہیں حویلی میں ہماری ضرورت ہے یا نہیں۔ جاگیر دار میرے تیوروں سے بھانپ گیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

”دنوا زخاں! جو بات ہے کھل کر بتاؤ۔ میں نے خود ایس پی صاحب سے کہہ کر تمہیں یہاں بلوایا ہے۔“

میں نے بلا توقف انہیں منوج کی بدتمیزی کے بارے میں بتا دیا۔ میری پوری بات سن کر جاگیر دار بولا۔

”دنوا زمیاں! ایس پی صاحب نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ تم ایک جرات مند اور ذہین پولیس افسر ہو۔ وہ تو پتے ہیں۔ اُن کی باتوں کا

غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر اُس نے حقے کا ایک طویل کش لیا اور تکیے۔ ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ”نواز پترا میں ایک بڑی الجھن میں گرفتار ہوں۔ بڑا کی دشمنی اتنی معمولی سی بات نہیں تھی منوج وغیرہ سمجھتے ہیں۔ منوج تو ابھی کل پیدا آتش ہے۔ یوں بھی نوجوان ہوش سے زیادہ جوش سے کام لیتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہی ہو گا بڑا کوئی معمولی بد معاشر نہیں۔ بے شمار ڈاکے اور قتل اُس کے کھا میں ہیں۔ یوں بھی ایک مفروضہ قاتل سے بڑے سے بڑے جرم کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جتنا جوان اور خوبصورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ جلد از جلد اُس کی شادی کر دوں۔“

”آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے“ میں نے ہنکارا بھرا۔

”لیکن اس میں ایک دشواری ہے“ جاگیر دار اپنی گھریلو باتیں بتانے پر آمادہ آ رہا تھا۔ ”جمنائی سورگ باسی ماں کی خواہش تھی کہ اُس کی شادی اپنے منہ بولے بھائی کی ط کرے۔ یہ خواہش اتنی شدید تھی کہ کوئی اُسے ٹلنے کی جرات نہ کر سکا لیکن مسئلہ کہ مرنے والی کے بھائی کا صرف ایک ہی لڑکا تھا اور اُس کی عمر جمنائے کے مقابلے بہت تھوڑی تھی۔ آج سے تین سال پہلے وہ شاید دوسری جماعت میں تھا۔ میں نے کی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ پُرانے خیال کی روایت پسند عورت تھی۔ اُس کا کہنا کہ عروں کے فرق کی کوئی بات نہیں۔ بہر حال اُس نے منہ بولے بھائی کے بیٹے سے اُس نسبت طے کر دی۔ اس واقعے کے ایک سال بعد وہ جھگوان کو پیاری ہو گئی۔ اب لڑکا گیارہ سال کا ہے۔ اگر ہم جمنائی کی شادی اُس سے کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کم از کم چھ سال اور انتظار کرنا ہو گا۔ دوسری طرف جمنائی کی عمر اکیس بائیس سال ہے۔ ایک آدھ میں اُس کی شادی ہو جانی چاہیے۔ اب یہ بڑا سنگھ کا مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا ہے۔ میر

”جناب تھانیدار صاحب! لڑائی جھگڑا چھوڑ دیں۔ ادھر ذرا روشنی میں بیٹھ کر اپنی پستول صاف کریں۔ میں نے سنا ہے اکثر عین موقع پر آپ لوگوں کی بندوبستیں فیمل ہو جاتی ہیں۔ اور ہاں، ذرا گیٹ کا دھیان رکھنے گا۔ میری سیلیاں بٹانے آئیں تو مجھے بتادیں“

میں نے جڑے بھینچ کر اپنے غصے کو قابو میں کیا اور لڑکی کو دیکھنا ہوا واپس مڑ گیا۔ میری توقع کے مطابق وہ دونوں میرے پیچھے ہسنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ان لوگوں کا پالانہ جانے کیسے پولیس افسروں سے پڑتا رہا تھا۔ مالک تو مالک گھر کے ملازمین بھی پولیس والوں کو فالتوسی چیز سمجھتے تھے۔ پہلے منوج اور اب لڑکی کے رویے سے مجھے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ اس قسم کی باتیں سن کر پی جانا میری سرشت میں نہیں تھا۔ پتر نہیں کیا تھا تھی جو میں اب تک خاموش تھا۔ بہر حال میں نے جاگیر دار سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ملازم کے ہاتھ بیغام بھیجا۔ جاگیر دار نے تھوڑی دیر بعد مجھے اندر بلالیا۔ میں نے جاگیر دار سے دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ انہیں جہلی میں ہماری ضرورت ہے یا نہیں۔ جاگیر دار میرے تیوروں سے بھانپ گیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

”نواز خاں! جو بات ہے کھل کر بتاؤ۔ میں نے خود ایس پی صاحب سے کہہ کر تمہیں یہاں بلوایا ہے۔“

میں نے بلا توقف انہیں منوج کی بدتمیزی کے بارے میں بتا دیا۔ میری پوری بات سن کر جاگیر دار بولا۔

”نواز میاں! ایس پی صاحب نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ تم ایک جرات مند اور ذہین پولیس افسر ہو۔ وہ تو پتے ہیں۔ ان کی باتوں کا

غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر اُس نے حقے کا ایک طویل کش لیا اور تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ”نواز پتر! میں ایک بڑی الجھن میں گرفتار ہوں۔ بڑا سنگھ کی دشمنی اتنی معمولی سی بات نہیں جتنی منوج وغیرہ سمجھتے ہیں۔ منوج تو ابھی کل کی پیدائش ہے۔ یوں بھی نوجوان ہوش سے زیادہ ہوش سے کام لیتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہی ہو گا بڑا کوئی معمولی بد معاشر نہیں۔ بے شمار ڈاکے اور قتل اُس کے کھاتے میں ہیں۔ یوں بھی ایک مفرد قاتل سے بڑے سے بڑے جرم کی توقع کی جاسکتی ہے جتنا جوان اور خوبصورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ جلد از جلد اُس کی شادی کر دوں۔“

”آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے“ میں نے ہنکارا بھرا۔

”لیکن اس میں ایک دشواری ہے“ جاگیر دار اپنی گھریلو باتیں بتانے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ ”جنا کی سوگ باسی ماں کی خواہش تھی کہ اُس کی شادی اپنے منہ بول بھائی کی طرف کرے۔ یہ خواہش اتنی شدید تھی کہ کوئی اُسے ٹہلنے کی جرأت نہ کر سکا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مرنے والی کے بھائی کا صرف ایک ہی لڑکا تھا اور اُس کی عمر جتنا کے مقابلے میں بہت تھوڑی تھی۔ آج سے تین سال پہلے وہ شاید دوسری جماعت میں تھا۔ میں نے جتنا کی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ پُرانے خیال کی روایت پسند عورت تھی۔ اُس نے کہا کہ عمروں کے فرق کی کوئی بات نہیں۔ بہر حال اُس نے منہ بول بھائی کے بیٹے سے اُس کی نسبت طے کر دی۔ اس واقعے کے ایک سال بعد وہ جھگوان کو پیاری ہو گئی۔ اب وہ لڑکا گیارہ سال کا ہے۔ اگر ہم جتنا کی شادی اُس سے کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کم از کم چھ سات سال اور انتظار کرنا ہو گا۔ دوسری طرف جتنا کی عمر کیس بائیس سال ہے۔ ایک آدھ سال میں اُس کی شادی ہو جانی چاہیے۔ اب یہ بڑا سنگھ کا مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا ہے۔ میری

تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر جتنا کا ہاتھ کسی اور کو تھمتا ہوں تو مرنے والی کی رُوح کو تکلیف پہنچے گی۔ اگر مرنے والی کا عند بنجاتا ہوں تو بڑکی کی عُمر نکل جائے گی۔

نکروں میں گھرا ہوا بگیاہ دار بالکل عام آدمی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اُس نے حقے کا طویل کش لیا اور تیکے سے ٹیک لگا کر چھت گھورنے لگا۔ میں باغ میں جتنا اور منوج کو جس انداز میں دیکھ چکا تھا میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے جاگیر دار کو ٹٹولنے کے لئے کہا۔

”جاگیر دار صاحب! بملے ہوتے حالات میں انسان کو بعض فیصلے بدلنے پڑتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اگر جاگیر دار فی زندہ ہوتیں تو موجودہ حالات میں بھی وہ جتنا کے جلد بیاہ کا سوتیلیں۔۔۔۔۔ یہ آپ کا گھریلو معاملہ ہے۔ میری دخل اندازی مناسب تو نہیں لیکن آپ نے بات کی ہے تو میں اتنا مشورہ ضرور دوں گا کہ جتنا کی شادی ہو جانی چاہیے۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی اچھا لڑکا ہے تو جلد از جلد اس فرض سے سبکدش ہو جائیں۔

جاگیر دار نے پُر سوچ انداز میں کہا ہاں بڑا کا تو ہے۔۔۔۔۔ منوج کے بارے میں کیا خیال خیال ہے تمہارا؟ پھر میرے جواب میں نے پہلے ہی کہا ”مسکد پھر دی مرنے والی کا آجاتا ہے اُسے کیا جواب دوں گا آگے جا کر“

میں جاگیر دار کے لکیروں بھرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ آج وہ مجھے پہلے سے زیادہ بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ شاید ان دنوں وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آج وہ پھر اپنے گھر کے کچھوڑاٹے تالاب کھودنے کے متعلق سوچ رہا ہے۔ تالاب کے لئے اُس نے جگہ تو چھوڑ دی ہے لیکن پُرانی رسمیں تو بڑا کرشمہ دانوں کی طرح تالاب بنانے اور اس میں نہانے کی اُسے ہمت نہیں ہو رہی۔

حویلی کا پہرہ دیتے ہوئے ہمیں کوئی ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ دونوں سپاہی اور بلال شاہ بیٹھے تاش وغیرہ کھیلتے رہتے۔ کبھی کبھار بلال شاہ نہر سے مچھلیاں پکڑنے چلا جاتا۔ وہ یہاں کے لوگوں سے کافی گھل مل گیا تھا اور میں اُس کے ذریعے حویلی کے ارد گرد کی صورتحال سے باخبر رہتا تھا۔ ایک جگہ فارغ بیٹھنا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ اگر اسی پی صاحب کا اصرار نہ ہوتا تو میں کبھی یہ ڈیوٹی قبول نہ کرتا۔ فراغت کی ان طویل گھڑیوں میں میں اکثر بالائی منزل کی کھڑکیوں میں جتنا کو آتے جاتے دیکھتا تھا۔ وہ ہر وقت اپنی سیلیوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور کھیل کود میں مصروف رہتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اپنے ارد گرد کے حالات کی اُسے کوئی پرواہ نہیں۔ ایک دو بار منوج بھی نظر آیا تھا۔ وہ بڑا مغرور قسم کا ہندو نوجوان تھا اُسے دیکھتے ہی جتنا کھل اٹھتی تھی اور اُس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک آ جاتی تھی۔ میں اس چمک کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ یہ تعریفی چمک عورت کی نظروں میں اُس وقت دکھائی دیتی ہے جب کسی ایسے مرد سے اُس کا سامنا ہو جسے وہ چاہتی ہو اور جو اُس کی حفاظت کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ اور یہ حقیقت تھی کہ منوج نہ صرف وجہ تھا بلکہ کھلے ہاتھ پیر کا ایک مضبوط اور تندخو نوجوان تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ حویلی کے گیٹ پر بیٹھ کر بوڑھا سنگھ کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ میں گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر اُس کی تلاش میں نکل جاؤں۔ بوڑھا سنگھ میرے لئے انتہائی نہیں تھا۔ ایک بار پہلے بھی میری اس سے مدد بھیڑ ہو چکی تھی۔ میں اُسے کوئی بہادر شخص تسلیم نہیں کرتا تھا۔ ہاں ایک بات تھی کہ وہ ہوشیار اور پھرتیلا ضرور تھا۔ عام سی جسامت کا شخص تھا۔ عمر کوئی ستائیس اٹھائیس سال کی ہو گی۔ پولیس کی مار نے ایک کان غائب کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے جب اُس کا گروہ اتنا بڑا نہیں ہوا تھا میں نے ایک چھاپے میں

اُسے پکڑ لیا تھا لیکن وہ حیرت انگیز چالاک سے میری آنکھوں میں ریت جھونک کر فرار ہو گیا تھا۔

میں اپنے کمرے سے باہر کمرسی پر بیٹھا خیالوں میں غرق تھا کہ ایک آواز سن کر چونک اٹھا۔ حویلی کے اندرونی حصے میں ڈھونک کی تھاپ سنائی دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لڑکیوں کے گانے کی آواز آتی۔ اس کا مطلب تھا جاگیردار نے جننا کی شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے آج صبح ہی سے شک ہو رہا تھا۔ کئی عورتیں حویلی کے اندر باہر آ جا رہی تھیں۔ منہج بھی دو تین روز سے نہیں آیا تھا۔ میں نے حویلی کے چوکیدار کو آواز دے کر بلایا۔

”جی صاحب! اُس نے لاٹھی ہاتھوں میں گھماتے ہوئے کہا۔

”یہ شوہر کیا ہے؟ میں نے پوچھا

”آپ کو نہیں معلوم، بی بی کا بیاہ ہو رہا ہے“ بی بی جی سے اُس کی مراد جننا تھی۔

”لڑکا کون ہے؟ میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

”جی وہی اپنے وجے بابو“

”وجے بابو“ میں سنائے میں رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا جاگیردار اُس گیارہ سالہ لڑکے

سے بیٹی کا بیاہ بچا رہا تھا، ایک لمحے میں جننا کا بھرپور سراپا میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ اُس کی شوخی اُس کا جوبن، متحرک ہونٹ اور ہنسنے والے گال سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے بے گزر گیا۔ یہ ظلم تھا سراسر ظلم۔ چھ سات سال بعد جب خاندان جوانی کی میٹھی پر قدم رکھے گا یہی بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑی ہوگی۔۔۔۔۔ راجوں، مہاراجوں اور جاگیرداروں کی خاندانوں میں اُسے بارے میں نے بہت کچھ سنا تھا لیکن ان رسموں کی سفاکی صبح معنوں میں آج مجھ پر کھلی تھی۔

اتنے میں دُور سے بلال شاہ کی جھلک نظر آئی۔ وہ قریباً بھاگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ وہ اتنی جلدی میں دکھائی دیتا تھا کہ مچھلیاں پکڑنے والی ڈور اس کے پیچھے گھسٹتی چلی آ رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ کوئی اہم خبر لے کر آ رہا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ چوکیدار کی پرواہ کئے بغیر کھٹاک سے دفتر میرے سر پر دے مارے گا۔ میں خود ہی چوکیدار کے قریب سے اُٹھ کر اُس کی طرف چلا گیا۔

”خان صاحب! وہ زور سے چیخا۔ میں نے اُسے آہستہ بولنے کا اشارہ کیا۔

”خان صاحب“ وہ بہت دھیمی آواز میں بولا ”بوٹا سنگھ۔۔۔۔۔“

میں نے اُسے آرام سے پوری بات بتانے کو کہا۔ بلال شاہ نے بتایا کہ ابھی بوٹا سنگھ اور اُس کے مسلح ساتھی سائڈ نیوں پر سوار پُل کی طرف گئے ہیں۔ بلال شاہ کے مطابق اُن کے ارادے خطرناک نظر آتے تھے۔ ایک لمحے میں میرا خیال جننا کی شادی کی طرف چلا گیا۔ کہیں وہ لوگ۔۔۔۔۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا۔ میں نے سپاہیوں کو فوراً گھوڑے تیار کرنے کا حکم دیا۔ اتنے میں جاگیردار بھی حویلی کے اندرونی دروازے سے باہر نکل آیا۔

”کیا بات ہے؟ پتہ نواز، کدھر کا ارادہ ہے؟“ اُس نے پوچھا۔

میں جلدی سے اُسے ایک طرف لے گیا ”جاگیردار صاحب۔ میرے ایک آدمی نے ابھی بوٹا سنگھ کو نہر کے پُل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میرا انداز ہے کہ وہ آپ کے داماد کو نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آپ کے آدمیوں کا ہمارے ساتھ ہونا ٹھیک نہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں دو پہر ڈھلے تک اُس کی مشکلیں کس کے آپ کے پاس لے آؤں گا۔“

جاگیردار کو تسلی دے کر میں اپنے تینوں آدمیوں کے ساتھ بوٹا سنگھ کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ جلد ہی ہمیں کچھ راستے پر سائڈ نیوں کے پاؤں کے نشانات مل گئے۔ بلال شاہ کے مطابق وہ کوئی چھ آدمی تھے اور تین کے پاس رائفلیں بھی تھیں۔ نہر کے پُل پر پہنچ کر ہمیں اندازہ ہوا کہ بوٹا سنگھ کا رخ جہنا کے سسرالی گاؤں کی طرف ہی ہے۔ ہماری رفتار میں مزید تیزی آگئی، کوئی دو کوس گھوڑے دوڑانے کے بعد ہمیں اپنے سامنے سائڈ نی سواروں کی اڑائی ہوئی دُھول نظر آنے لگی۔ شدید گرمی اور تپتی ہوئی دوپہر میں یہ دُھول کسی صحرائی بگولے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جونہی ہم ایک ویران رہٹ کے قریب سے گزرے چھ سات نقاب پوش پاس کی بھڑیلوں سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے برآمد ہوئے اور ہم پر حملہ آور ہو گئے۔ اُن کا اندازہ تو ایسا ہی تھا کہ جیسے ہمیں روندتے ہوئے گزر جائینگے اور وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ بلال شاہ سمیت دونوں سپاہی لائیبوں کی ضربیں کھا کر گھوڑوں سے نیچے گر گئے تھے۔ لیکن میں چونکہ ذرا آگے تھا اس لئے ان کی زد سے محفوظ رہا۔ یہ کچھ سوچنے کا نہیں کرنے کا وقت تھا۔ میں نے گھوڑے کو تیزی سے واپس موڑا۔ ریو اور میں اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ میں نے مڑتے ساتھ ہی دیکھ لیا کہ صرف دو آدمیوں کے پاس رائفلیں ہیں۔ میں نے قریب والے شخص پر دو فائر کئے۔ ریو اور کی ٹسک رفتار گولیاں دھماکوں سے اُس کے بازو اور چھاتی میں گھس گئیں۔ دوسرے شخص نے رائفل سیدھی کی ہی تھی کہ نیچے گرے ہوئے بلال شاہ نے امچھل کر رائفل تھام لی۔ پھر ایک زوردار جھٹکے سے اُس نے رائفل چھین لی۔ رائفل ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سارے گھر سوار بلال شاہ کی طرف پکے۔ اس سے پہلے کہ وہ برچھیاں استعمال کرتے، میں ہوائی فائر کرتے ہوئے گر جاؤں خبردار جان سے مار دوں گا۔“

حملہ آور ٹھٹکے اتنے میں بلال شاہ بندوق سنبھال چکا تھا۔ اب ایک طرف سے وہ بندوق اور دوسری طرف سے ریو اور کی زد میں تھے۔ زخمی شخص گھوڑے پر اونڈھا پڑا تھا اور اُس کا گھوڑا جھکٹ بھاگا رہا تھا۔ باقی چھ آدمی ہراساں نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک ڈیل ڈول سے سرخندہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ریو اور کا رخ اس کی پیشانی کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”پکڑی ہٹاؤ پھرے کے اوپر سے۔“

وہ گم سم کھڑا رہا۔ میں نے پھر تھکا نہ لمحے میں اپنا فقرہ دہرایا۔ اُس کا ہاتھ چھ بھی پکڑی کی طرف نہیں گیا۔ ایک ساعت کے لئے میری نظر دوسرے افراد کی طرف اٹھی تھی کہ آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ غیر ارادی طور پر میں نے اپنا سُر ایک جانب جھکایا اور کوئی چیز سننا تو ہوئی میرے کان کے نزدیک سے گزر گئی۔ حملہ آوروں کے سرخندہ نے تاک میرے اوپر برجھی پھینکی تھی۔ جب میں نے اُس کی طرف دیکھا اُس کا گھوڑا برق رفتاری سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ نقاب پوش کا یہ دار اپنی مثال آپ تھا۔ ایک لمحے میں نہ صرف اُس نے مجھ پر برجھی پھینک دی تھی بلکہ اتنی تیزی سے گھوڑے کو ایڑ لگائی تھی۔ اور گھوڑے نے بھی اتنی تیزی سے اپنے سوار کا ساتھ دیا تھا کہ مجھے ریو اور استعمال کرنے کی ہمت نہیں ملی۔ میں جب خود کو گھوڑے کی زد سے ہٹا کر سنبھلا گھوڑا پس پچھیں گزرا گئے نکل چکا تھا۔ میں نے دو گولیاں چلائیں۔ ایک گولی گھوڑے کی پشت پر لگی لیکن سوار محفوظ رہا۔ بلال شاہ بندوق ہاتھوں میں تھامے تہذیب کے عالم میں کھڑا تھا۔ میں نے اُس سے بندوق لے کر دو گولیاں اور چلائیں لیکن حملہ آور دُور نکل چکے تھے۔ ایک لمحے کے لئے میں نے اُن کے تعاقب کا سوچا لیکن پھر میرا دھیان بوٹا سنگھ کی طرف چلا گیا۔ سائڈ نی سواروں

جاگیردار نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ”بھئی وہ بتا تو رہا ہے کہ کچھ لوگوں نے پولیس پارٹی کو راستے میں روک لیا تھا“
 ”یہ سب باتیں ہیں“ منوج اگ بگولا ہو کر بولا ”ان کو کس حکیم نے کہا تھا کہ بغیر کسی کو بتائے کیلے ہی بوٹا سنگھ سے پٹنے چلے جائیں۔ ہماری رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی ہے ان لوگوں نے“

میں نے مجرموں سے پھینکی ہوئی بدوق اُس کے سامنے کرتے ہوئے کہا ”یہ بدوق اور میرے آدمیوں کے پھٹے ہوئے سر کیا یہ بتانے کے لئے کافی نہیں کہ میں سچ کہہ رہا ہوں“

”یہ سب چال بازیوں ہوتی ہیں پولیس والوں کی“ منوج نے جھنجھکا کر کہا اور پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ میں نے بھی کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ ایس پی صاحب سے رابطہ قائم کروں اور اُن سے کہوں کہ مجھے ”چوکیداری“ کے اس فرض سے سبکدوش کر دیں۔ میں ایک علی آدمی تھا۔ فراغت مجھے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ دوسری طرف میں دیکھ رہا تھا کہ منوج کا اس حویلی میں کافی اثر و رسوخ ہے اور وہ مجھے پسند نہیں کرتا۔ بہتر یہی تھا کہ میں واپس چلا جاؤں لیکن ایک چیز ایسی تھی جو مجھے بار بار اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میرا یہ شک روز بروز بڑھتا چلا گیا کہ بوٹا سنگھ لڑکی کو اغوا کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے اب تک کے تمام واقعات کا بغور جائزہ لیا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ اگر بوٹا سنگھ لڑکی کو اغوا کرنا چاہتا یا اُسے نقصان پہنچانا چاہتا تو کامیاب ہو سکتا تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہ صرف ان لوگوں کو خوفزدہ کرنا چاہتا ہے۔ جب اُس نے پہلی دفعہ حویلی پر ہلہ بولا تھا تو میں

کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ اگر ہم گھر سواروں کے تعاقب میں نکل جاتے تو بوٹا سنگھ کا وار چلنا یقینی تھا۔ سپاہی محمد حسین کا بازو اتر گیا تھا، بلال شاہ کا سر بھی پھٹ گیا تھا لیکن میں نے بغیر مرہم پٹی کے انہیں سائٹی سواروں کے پیچھے چلنے کا حکم دیا۔ پوری رفتار سے گھوڑے جھگاتے ہوئے جب ہم کوئی آدھ گھنٹے بعد مادھوپور میں داخل ہوئے، بوٹا سنگھ اپنا کام کر چکا تھا۔ جاگیردار کے داماد یعنی نوعمر وجے کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ وجے کے باپ نے ہمیں روٹے ہوئے جو تفصیلات بتائیں اُن سے معلوم ہوا کہ بوٹا سنگھ نے یہ کام بڑی صفائی سے بغیر خون خرابے کے کیا تھا۔ اُس کے ساتھی گاؤں سے باہر موجود رہے تھے۔ وجے گلی میں کھیل رہا تھا۔ بوٹا سنگھ اُسے درغل کر گاؤں سے باہر لے آیا تھا۔ یہاں سے وہ لوگ اُسے آگے لے گئے تھے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے وجے کے گھر والوں کو اس کی اطلاع دی تھی۔ میں نے گاؤں سے چند آدمیوں کو ساتھ لیا اور فوراً بوٹے کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ شام تک ہم نے کسی جگہ چھاپے مارے لیکن مجرموں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

میں جاگیردار کے کمرے میں داخل ہوا تو منوج دہاں موجود تھا۔ دو تین اور آدمی بھی سر جھکاتے خاموش بیٹھے تھے۔ وجے کے اغوا کی خبر انہیں بل چکی تھی۔ جاگیردار نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے انہیں مختصر لفظوں میں بتایا کہ کس طرح راستے میں کچھ آدمیوں نے ہم پر ہلہ بول دیا اور ہم مجرموں کا تعاقب جاری نہ رکھ سکے۔ منوج خاموشی سے میری باتیں سن رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا اُس کے اندر لاوا پک رہا ہے۔ میرے خاموش ہوتے ہی بولا۔

”تھانیدار جی! آپ زندگی میں کسی جگہ وقت پر بھی پہنچے ہیں یا نہیں؟“

کے حفاظتی انتظامات نہ ہونے کے برابر تھے۔ بٹا سنگھ چوری پھٹے یا علی الاعلان چوری میں داخل ہو سکتا تھا لیکن پرمیادوں کی معمولی مزاحمت پر وہ بھاگ گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اُس کا منشا لڑکی کو اغوا کرنا نہیں تھا پھر اُس کا منشا کیا تھا؟ وہ جاگیردار کو خوفزدہ کر کے کیا حاصل کرنا چاہتا تھا؟ یہی پہلو میرے لئے پُر اسرار تھا۔ میں کتنی ہی دیر اس پہلو پر غور کرتا رہا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے سوچ بچار صبح پر ملتوی کی اور سو گیا۔ صبح ایک غیر مانوس شور سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں کافی دیر تک سوتا رہا تھا۔ دُھوپ کافی چڑھائی تھی۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ جوہلی کے وسیع و عریض صحن میں باغ کی جانب مجمع لگا ہوا تھا۔ تین آدمی دو عورتوں کو ہنٹروں سے پیٹ رہے تھے۔ ایک عورت ادھیڑ عمر اور دوسری نوجوان تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان عورت کی گود سے شیر خوار بچہ زمین پر گر پڑا لیکن مارنے والوں نے اُسے بچہ اٹھانے کی مہلت بھی نہیں دی۔ قریب ہی تین آدمی نیم بے ہوشی کے عالم میں سک رہے تھے۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر منوج دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا تھا۔ جاگیردار بھی پاس ہی موجود تھا۔ پھر جاگیردار نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ہنٹر سانسے والے رُک گئے۔ جاگیردار منوج سے باتیں کرتا ہوا جوہلی کے اندر چلا گیا۔ میں جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے باہر آیا گاؤں والے زخمی عورتوں اور مردوں کو سہارا دیتے خاموشی سے باہر لے جا رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر بلال شاہ نے بتایا کہ جاگیردار کے اصطل میں سے ایک قیمتی گھوڑی چوری ہو گئی ہے۔ ان لوگوں کو رستہ گیری کے شبے میں پٹیا جا رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ ان لوگوں سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔

گھوڑی دیر بعد جاگیردار کی طرف سے بلالوا آگیا۔ میں اس وقت ناشتہ کر رہا تھا۔

ناشتہ کر کے میں اندر پہنچا تو جاگیردار سخت غصے میں نظر آ رہا تھا۔ منوج بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اصطل بلالگران ہاتھ باندھے اُن کے پیچھے کھڑا تھا۔ جتنا بھی ایک کمرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں سو جھی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا گھوڑی دیر پہلے تک روتی رہی ہے۔ سیاہ دوپٹے میں اُس کا چہرہ کچھ زیادہ ہی نکھرا ہوا لگا رہا تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کافی خوبصورت ہے۔ جاگیردار نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں سے ایک گھوڑی چوری ہو گئی ہے۔ یہ ہماری بیٹی کی لاڈلی گھوڑی تھی۔ ہم ہر قیمت پر وہ گھوڑی اصطل میں واپس دیکھنا چاہتے ہیں“

اتنے میں منوج بولا ”دیکھو تھا نیلار جی! میں بات کرتا ہوں صاف اور سیدھی۔ ہمیں آپ کے ایک آدمی پر شبہ ہے۔ وہ مٹا سا لمبا سا کیا نام ہے اُس کا بلال۔ وہ ہر وقت اصطل کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ اصطل کا چکیدار گواہ ہے اس کی حرکتوں کا۔ کچھ بھی ہو ہمیں شام تک گھوڑی واپس ملنی چاہیے ورنہ....“

”بس منوج صاحب! میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے چپ رہنے کو کہا۔ اب کوئی لفظ زبان سے نہ نکالنا۔ تم نے میرے آدمی پر نہیں مجھ پر شک کیا ہے۔ چور کوئی بھی ہوشام سے پہلے گھوڑی اصطل میں پہنچ جائے گی“

میں اُٹھا اور تیزی سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ خون کی گردش سے میری کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ ان لوگوں نے ایک طرح مجھ پر چوری کا شبہ کیا تھا۔ میں جواب تک چوروں، ڈاکوؤں کے لئے دہشت کا نشان تھا اس جاگیر میں اگر خود چور ٹھہرا جا رہا تھا۔ اور یہ سب منوج کا کیا دھرا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ بیٹے کے بیٹے اُم نے نوازخان سے ٹکری ہے اب جھگڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ“ میں نے دل میں سوچا۔

منوج کا اُدھار چکلنے سے پہلے مجھے جتنا کی گھوڑی برآمد کرنا تھی۔ میں جب کمرے سے باہر نکل رہا تھا، جتنا کی آواز سنائی دی تھی وہ جاگیردار سے کہہ رہی تھی ”پتا جی! آپ پھر اس تھانیدار کی بات پر بھروسہ کر رہے ہیں۔ آپ اپنے آدمیوں سے گھوڑی تلاش کیوں نہیں کر دیتے؟“ اس کی یہ آواز میرے کانوں میں سیسہ پگھلا رہی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا تھا کہ ان لوگوں کے ذہن میں اب تک میرا کوئی اچھا تاثر قائم نہیں ہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آج شام تک گھوڑی کو زندہ یا مردہ برآمد کر کے رہوں گا۔“

میں جب باہر آیا بلال شاہ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چمک گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں غصے میں ہوں اور اب کچھ ہونے والا ہے۔ میں نے اُسے ساتھ لیا اور سیدھا اصطبل کی طرف چل دیا۔ اصطبل جو بیل کے بالکل ساتھ ہی واقع تھا۔ اُس وقت دہاں کوئی تیس گھوڑیاں گھوڑے موجود تھیں۔ دو ملازم اُن کے آگے چارہ وغیرہ ڈال رہے تھے۔ میں نے گہری نظروں سے اصطبل کا معائنہ کیا۔ چور موقعہ واردات پر کوئی نہ کوئی نشان ضرور چھوڑتا ہے۔ ایک جگہ مجھے سیاہی مائل چپ چپی سی شے فرش پر گری ہوئی نظر آئی۔ میں نے انگلی لگا کر سونگھا اس میں سے ناگوار بو اُٹھ رہی تھی۔ بلال شاہ گھوڑوں اور اُن کی خوراک وغیرہ کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔ میں نے مانع اُس کے ہتھوں سے لگاتے ہوئے پوچھا ”کیا ہے؟“ اُس نے زور سے سانس اندر کی طرف کھینچا اور بولا۔

”یہ دوائی ہے جی۔ مویشیوں کے زخموں پر لگاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے“ میں نے جلدی سے کہا ”ان تمام جانوروں کو دیکھو کسی کو زخم تو نہیں“

’بلال شاہ جلدی جلدی اصطبل میں گھوم گیا“ نہیں غاں صاحب“ اُس نے آکر بتایا۔ میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا گھوڑی چرائی نہیں گئی تھی

زخمی ہوئی تھی۔ اُس کی مرہم پٹی کے لئے دوائی اصطبل سے باہر لے جاتی گئی تھی۔ اس بات کو جاگیردار سے چھپایا گیا تھا۔ کہیں یہ منوج کا کام تو نہیں۔ وہ اکثر اصطبل سے گھوڑے لے کر جاتا رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ گھوڑی لے کر گیا ہو۔ وہ زخمی ہو گئی ہو اور اُس نے جاگیردار یا جتنا کے خوف سے اسے کہیں چھپا دیا ہو۔ یہ بہت ممکن تھا۔۔۔۔۔ ایک دم ذہن میں جھکا سا ہوا۔ کل دوپہر کا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ جب نقاب پوش نے جھڑ پر گھوڑا چڑھایا تھا اور میں نے پہلو بچا کر اس پر گولی چلاتی تھی۔ ایک گولی گھوڑے کو لگی تھی۔۔۔۔۔ یقیناً یہ وہی گھوڑی تھی۔۔۔۔۔ وہ میرے خدا اس کا مطلب تھا منوج اور بوٹا سنگھ ساتھی تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ذہن ایک لمحے میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ بلال شاہ منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ”بلال! میں نے کھوتے ہوئے ہچے میں کسا“ کل جو گھوڑی زخمی ہوئی تھی تمہیں یاد ہے؟“

”ہاں سفید گھوڑی تھی“ بلال شاہ نے کہا اور پھر اس کی آنکھوں میں ایک دم حیرت نظر آنے لگی۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں بلال شاہ! وہ گھوڑی اسی اصطبل سے گئی تھی۔“

پھر میں نے بلال شاہ کو کہا کہ اصطبل کے نگران کو بلال لاتے۔ تھوڑی دیر بعد نگران آگیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک جہانمیدہ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا اضطراب یا خوف نہیں تھا۔ میں نے دونوں ملازموں کو باہر نکال کر اصطبل کا دروازہ بند کر دیا۔

”دیکھو۔ جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں معلوم ہے تم نے زخمی گھوڑی کہاں چھپا رکھی ہے۔ جب تم اصطبل سے دوائی لے کر گئے تھے میرا آدمی تمہارے پیچھے تھا۔“

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب کچھ تم سے کس نے کروایا ہے لیکن میں تمہاری زبان سے سُنا چاہتا ہوں۔ ”ننگران کی آنکھوں میں ہلکا ہلکا خوف نظر آ رہا تھا لیکن بظاہر وہ پُرسکون تھا۔ اُس نے تمام واقعے سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔

”میں نے پھر کہا ”دیکھو میاں! اگر تمہیں کسی کا خوف ہے تو دل سے نکال دو۔ اس حویلی میں ”انقلاب“ آنے والا ہے جو نام تمہاری زبان پہنچے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اب بے خطر ہو کر وہ نام بول دو۔“

ننگران پھر بھی خاموش رہا۔ میرا پارہ ایک دم نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لئے۔ پھر ایک جھٹکے سے اُسے اوندھے منہ زمین پر گرادیا۔ اُس کی گرون قابو میں کر کے میں نے دونوں بازو پشت کی طرف موڑ دیئے۔ ”چاقو نکالو بلال شاہ“ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ بلال شاہ نے شہوار کے نیچے سے گرا دی والا چاقو نکال لیا۔ میں نے اُسے آنکھوں سے اشارہ کیا اس نے ”کرار“ کی ٹونک آواز سے چاقو کھولا اور ننگران کے مڑے ہوئے ہاتھ کی انگلی ہاتھوں میں ختم کی۔

”کس کے کہنے پر تم یہ سب کچھ کر رہے ہو؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

”مجھے کچھ معلوم نہیں، مجھے کچھ معلوم نہیں“ وہ حلق کی پوری قوت سے چنچا۔

”کاٹ ڈالو انگلی“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

بلال شاہ کا چاقو حرکت میں آیا اور ننگران کی دلدوز چیخ سن کر گھوڑے اچھل کود کرنے لگے۔

”کس کے کہنے پر تم یہ سب کچھ کر رہے ہو؟“ میں نے پھر اپنے الفاظ دہراتے۔

وہ فوج ہوتے ہوتے بحرے کی طرح پیچ رہا تھا۔ میں نے بلال شاہ سے کہا دوسری انگلی بھی کاٹ ڈالو۔ بلال شاہ نے اس کی دوسری انگلی پچڑی ہی تھی کہ وہ چلانے لگا۔ ”بتانا ہوں سب کچھ بتانا ہوں“ اس کے بعد وہ فر فر بولنے لگا۔ اُس نے بتایا کہ منوج بابو نے حکم دیا تھا کہ گھوڑی کے زخمی ہونے کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ وہی کل دوپہر گھوڑی امصبل سے لے کر گئے تھے۔ جب وہ اپنا بیان مکمل کر چکا میں نے اُسے سیدھا کر کے زمین سے اٹھایا۔ اُس نے جلدی سے اپنے خون آلود ہاتھ کی طرف دیکھا لیکن انگلی ہاتھ پر ہی موجود تھی۔ بلال شاہ کا لگایا ہوا زخم چھاتی انچ سے گہرا نہیں تھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد میں زخمی گھوڑی لئے ہوئے حویلی میں داخل ہو رہا تھا۔ منوج نے اُسے گاؤں سے باہر اپنے ایک دوست کے ڈیرے پر باندھ رکھا تھا۔ میں نے گھوڑی امصبل میں پہنچائی اور جاگیر دار کے کمرے میں جا کر اُسے برآمدگی کی خبر سنائی۔ پھر میں نے اُس سے اجازت طلب کی۔ جاگیر دار نے جانے کا سبب پوچھا تو میں نے بتایا کہ میں ایک مجرم کے خلاف کارروائی کرنا چاہتا ہوں اور اُس کے گھر میں رہ کر میں اُس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ جاگیر دار حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہاں جاگیر دار صاحب“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ”منوج آپ کا بھتیجا ہے اور آپ اسے بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں۔ لیکن وہ مجرم ہے۔ یہ وہی گھوڑی ہے جو کل میری گولی سے زخمی ہوتی تھی اور کل یہ گھوڑی منوج کے نیچے تھی۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ جاگیر دار نے چونک کر کہا۔

”منوج، بڑا سنگھ کا ساتھی ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا ”وہ بڑا سنگھ کے ذریعے آپ کو نو فزدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”کیوں اُس کا کیا فائدہ ہے اس میں؟“ جاگیردار کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
 ”سننا چاہتے ہیں تو سنیے۔ وہ آپ کی بے شمار دولت کے لالچ میں آپ کی بیٹی سے
 شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ آپ بوٹا سنگھ کی کارروائیوں سے پریشان ہو کر
 جتنا کی فوری شادی کا فیصلہ کر لیں۔ اس صورت میں قرعہ یقیناً اُس کے نام نکلنا لیکن آپ
 نے شادی کا فیصلہ تو کر لیا مگر اماند منوج کی بجائے وجے ہی رہا۔ اپنی جیت کو ہار میں
 بدلتے دیکھ کر اُس نے بوٹا سنگھ کے ہاتھوں وجے کو اٹھوانے کا پروگرام بنایا۔ جب میں
 بوٹا سنگھ کے تعاقب میں روانہ ہوا تو منوج خبردار ہو گیا۔ وہ اُس وقت یہیں موجود تھا۔
 اُس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پولیس پارٹی کا تعاقب کیا اور راستے میں روک لیا۔
 بعد کے واقعات آپ جانتے ہی ہیں۔“

جاگیردار کے چہرے پر رزولے کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا
 جیسے اُس کے کسی اندرونی خدشے کی تصدیق ہو گئی ہے۔

اُس شام حویلی میں زبردست طوفان آیا۔ جاگیردار نے مجھے منوج کو گرفتار کرنے کی
 اجازت تو نہیں دی لیکن جب وہ حویلی میں آیا تو اُسے دھتکے دے کر باہر نکلوا دیا۔ منوج نے
 حویلی کے دروازے پر کھڑے ہو کر بھگوان کی قسم کھائی کہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اُس
 کا خیال تھا اُس کی بے عزتی کا دفتر دار صرف میں ہوں۔ جاگیردار کو دل کا دورہ پڑا۔ جتنا
 نے مجھ سے بدکلامی کی۔ میں نے حویلی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا لیکن جاگیردار منتوں واسطوں
 پر اُتر آیا۔ اُس نے مجھے جانے سے روک لیا۔ حویلی میں موجود منوج کے ساتھ ملے ہوئے
 تمام ملازمین کو چھٹی دے دی گئی۔ جاگیردار کا فی بیمار ہو گیا تھا۔ میں نے امرتسر سے اپنے
 ایک واقف کار ڈاکٹر کو بلوایا۔ اُس نے بڑی توجہ سے جاگیردار کا علاج کیا۔ کوئی ایک

ہفتے بعد جاگیردار کی حالت کچھ سنبھلی۔ اُس نے مجھے اپنے پاس بلا کر کہا۔
 ”فواز! تم ایک سرکاری ملازم ہو لیکن جس طرح تم نے اس حویلی کی حفاظت کی ہے۔
 میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں چکا سکتا۔ ان چند دنوں میں تم مجھے گھر کے ایک فرد کی طرح
 لگنے لگے ہو۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ مجھے کچھ روز کے لئے لاہور جانا پڑے گا۔ میں یہاں کا
 انتظام بڑے منشی صاحب کو سونپ کر جا رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے وہ بڑے نیک
 طبیعت اور صلح جو آدمی ہیں۔ تمہیں اُن سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں چاہتا ہوں
 کہ تم حویلی کی پوری طرح دیکھ بھال کرو۔ جتنا کو میں نے سمجھا دیا ہے۔ وہ سچی ہے اگر کوئی
 بات کہہ دے تو بُرا نہ ماننا۔“

میں جاگیردار کی بات سمجھ رہا تھا۔ میں نے انہیں پوری تسلی دی۔ اگلے روز وہ لاہور
 روانہ ہو گئے۔

بڑے منشی عطا صاحب بڑے نیک اور مخلص آدمی تھے۔ ان چند ہفتوں میں میں
 انہیں اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ جاگیردار کو ان پر اندھا اعتماد تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ جتنا
 کاروبار اُن سے ٹھیک نہیں۔ جاگیردار کے جانے کے بعد میں نے ایک دو بار جتنا کو
 بڑے سخت لہجے میں منشی صاحب سے باتیں کرتے ہوئے سنا۔ ایک روز تو حد ہو گئی۔
 میں اپنے کمرے کے سامنے کُرسی پچھلتے بیٹھا تھا۔ میرے سامنے منوج کا وہ دوست
 تھا جس کے دیرے سے مسرور گھوڑی برآمد ہوئی تھی۔ پچھلے تین روز سے میں اُس
 سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ لیکن اُس نے منوج یا بوٹا سنگھ کے بارے میں کوئی کارآمد بات
 نہیں بتائی تھی۔ حویلی سے جانے کے بعد منوج نائب ہو گیا تھا اور کئی روز گزرنے کے
 باوجود اُس کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا۔ ابھی میں باتوں میں مصروف تھا کہ اوپر بالکونی سے

شور کی آواز سنائی دی۔ میں بھاگتا ہوا در پر پہنچا۔ ایک انتہائی تکلیف دہ منظر میرے سامنے تھا۔ جتنا اور اس کی سہیلیاں عطا صاحب کو جوتیوں سے پیٹ رہی تھیں عطا صاحب کے ہاتھ میں شاید کچھ جبرست تھے، کچھ جبرست زین پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے بمشکل انہیں روک کر سے نجات دلائی۔ ان کی عینک ٹوٹ چکی تھی وہ بازوؤں میں منہ چھپا کر زار و قطار روتے گئے۔ جتنا پچھری ہوئی شیرنی کی طرح ان پر چھپٹ رہی تھی۔ وہ اس وقت اُدھوے اور نامکمل لباس میں تھی۔

”یہ بُری نیت سے میرے کمرے میں آیا تھا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی“ وہ غراتی عطا صاحب ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے ”خدا کی قسم میں ساتھ والے کمرے میں جبرست رکھنے گیا تھا۔ غلطی سے اس کمرے میں داخل ہو گیا“

”داڑھی والے شیطان میں تیری کھال اُچھڑ دوں گی“ وہ جیجی۔ میرا دماغ سننا اُٹھا۔ پھر میرا ہاتھ اُٹھا اور ایک زوردار قبضہ جتنا لے گا لے گا پر پڑا۔ وہ لڑکھڑاکر دیوار سے جا ٹکرائی۔ تمام لڑکیاں چیختی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں۔ وہ پھٹی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے عطا صاحب کو سہارا دیا اور نیچے لے آیا۔ کافی دیر میں اُن کی دلجوئی کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ برابر روتے جا رہے تھے ”خدا کی قسم میں نے اُسے گود میں کھلایا ہے۔ وہ بار بار یہ الفاظ دہرا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر چلے گئے۔ کوئی دو گھنٹے بعد ایک ملازم نے مجھے ایک خط لاکر دیا۔ یہ عطا صاحب کی طرف سے تھا۔ اس میں اب تک کے حساب کتاب کی مکمل تفصیل درج تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے تھے۔ آخر میں انہوں نے ایک فقرہ لکھا تھا ”اگر مجھے حرام موت کا خوف نہ ہوتا تو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر موت کو گلے لگا لیتا۔“ فواز صاحب! میرے بیوی بچوں کو کہہ دینا

کہ میں مرجھا ہوں۔ خدا حافظ“

میرا دل چاہ رہا تھا اس بد ذات لڑکی کے ٹکڑے کر دوں۔ اُسے منشی جی کے جانے کی ”خوشخبری“ سنانے کے لئے جب میں حویلی کے اندر گیا تو وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ اُس کا کمرہ خالی تھا۔ سہیلیاں بھی موجود نہیں تھیں۔ حویلی کی بوڑھی خادمہ نے بتایا کہ وہ ابھی کالو کے ساتھ بیڑھیاں اُتر کر نیچے گئی ہے۔ کالو وہی پہلوان ناشخص تھا جو برہمی تھا مے ہر وقت جاگیر دار کے ساتھ رہتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا وہ اُس کے ساتھ کہاں گئی ہے۔ پچھلے ہر تک جب لڑکی کی اطلاع نہیں ملی تو میرا تھاٹھنکا۔ اس وقت مادھو پور تھانے کا انسپکٹر قربان علی بھی مجھ سے ملے آگیا۔ وہ ”دبے“ کے انگوکی تقشیش میں مصروف تھا۔ اُس نے کہا کہ ابھی تک دسکے کا کوئی سراغ ہاتھ نہیں آیا۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ حویلی کا ایک تانگہ اسٹیشن جانے والے راستے پر جا رہا تھا۔ اُس میں ایک لڑکی اور موٹا سا ایک شخص سوار تھے۔ اُس نے مرٹے شخص کا حلیہ بیان کیا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ جتنا اور کالو کا ذکر کر رہا ہے۔ میرے لئے یہ اچھا موقع تھا۔ قربان علی کو حویلی میں چھوڑ کر میں جتنا کی تلاش میں جا سکتا تھا میں نے اُسے پوری بات سمجھائی۔ وہ بیچارا آج رات اپنے گھر جا رہا تھا۔ دو تین روز میں اس کی شادی ہونے والی تھی۔ بہر حال میرے اصرار پر اُس نے رکنے کی حامی بھر لی۔ اسے ہدایات دے کر میں بلال شاہ کے ساتھ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسٹیشن دہان سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ راستہ کتچا اور دستوار گزار تھا۔ ہم گھوڑوں پر سوار تھے جس رفتار سے ہم جا رہے تھے، تانگے کے لئے اس سے آدھی رفتار بھی برقرار رکھنا مشکل تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ ہم راستے ہی میں تانگے کو جا لیں گے۔ نصف راستے میں اندھیرا پڑ گیا۔ رات تاریک تھی اور دُور دُور تک

کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ راستہ غیر آباد زمینوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ گندم کے ادھ پکے کھیت بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اچانک ایک آواز سن کر میں چونک گیا۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی گھٹی ہوئی آوازیں جینا ہو چرخ کسی عورت کی لگتی تھی۔ چند لمحوں بعد ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی ایک ادیچھ سنائی دی۔ اس بار آواز بالکل صاف تھی کوئی عورت مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ میں نے گھوڑا روکا۔ بلال شاہ بھی رُک گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور گھوڑے ایک درخت سے باندھ کر گھنی جھاڑیوں کی طرف چل دیتے۔ تھوڑی سی دُور مجھے اندھیرے میں کوئی چیز نظر آئی۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو یہ حویلی کا تانگہ خالی تھا اور گھوڑا گھاس پر منہ مار رہا تھا۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ بلال شاہ کو تانگے کے قریب رکنے کا کہہ کر میں نے پستول نکالا اور جھاڑیوں میں گھس گیا۔ جب دوسری بار پیچ کی آواز سنائی دی تھی میں نے سمت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ بڑی احتیاط سے چلنا ہوا میں آگے بڑھ رہا تھا۔ دوسری پیچ کے بعد کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ قریباً پانچ منٹ چلنے کے بعد مجھے ایک جگہ سفید دھبہ سا نظر آیا۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو یہ جھاڑی میں لٹکی ہوئی ریشمی کپڑے کی ایک دھچی تھی۔ میں نے آنکھوں کے قریب لاکر غور سے جائزہ لیا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ جتنا مصیبت میں تھی۔ یہ اُس کی قمیض کا ایک ٹکڑا تھا۔ میں چند قدم اور آگے بڑھا تو ایک جانب سے کھسر پھسر کی آواز سنائی دی۔ تب ایک مرد کا مقہ سُنائی دیا۔ میں نے پستول چیک کیا اور دبے قدموں چلتا ہوا آواز کی سمت بڑھنے لگا۔ کوئی تیس گز آگے جھاڑیوں کے درمیان تھوڑی سی کھلی جگہ پر کسی شخص کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ میں پہچان گیا۔ یہ ”کالو“ تھا۔ جتنا زمین پر گری ہوئی تھی۔ کالو کہہ رہا تھا۔

”بھاگ لو دیوی۔ جتنا بھاگ سکتی ہو بھاگ لو۔ دس دس کوس چاروں طرف پیرے میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ تمہارے پتا کا نمک خوار ہوں۔ بھگوان کی سونگہ جب تک بھاگتی رہو گی تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔“ جتنا کہ ہانپنے کی آواز میں اتنی دُور سے سُن رہا تھا۔ جسے وہ محافظ سمجھ کر لائی تھی وہ لیڑا بن گیا تھا۔

”کالو بھگوان سے دُرو۔ میں کہتی ہوں بھگوان سے دُرو“ وہ تھکی ہوئی آواز میں بولی۔

جواب میں کالو کا بلند مقہ سنائی دیا ”میں تمہارے بھاگنے کا انتظار کر رہا ہوں دیوی“

میں نے دیکھا جتنا کہ ہیولے میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ کالو تھوڑی دیر اُس کی طرف دیکھتا رہا پھر جھومتا ہوا اُس کی طرف بڑھا۔ جتنا کی گھٹی ہوئی پیچ بلند ہوئی۔ اس سے پہلے کہ کالو اُس کے جسم سے کپڑے کی دھجیاں فوج ڈالتا میں نے جھاڑیوں سے نکل کر اُسے لاکرا۔ وہ تیزی سے گھوما اور یوں میری طرف دیکھنے لگا جیسے مجھے جھوٹ سمجھ رہا ہو۔ اس کے ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی میں تیزی سے آگے بڑھا اور میری زوردار ٹانگ اُس کے منہ پر پڑی وہ الٹ کر جھاڑیوں کے قریب جاگرا۔ کرتے وقت اس کی بوتل کسی پتھر سے ٹکرائی اور ٹوٹ گئی۔ سر جھٹک کر وہ تیزی سے اُٹھا اور خوفناک انداز سے میری طرف بڑھنے لگا۔ ٹوٹی ہوئی بوتل وہ چاقو کے انداز میں لہرا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول شاید اُسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اُسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا ”خبردار میرے ہاتھ میں پستول ہے“ لیکن میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ اُچھلا

کی طرف چل دیا۔

میں نے دونوں گھوڑے بلال شاہ کے سپرد کئے اور خود جنا کو لے کر تلنگے پر گیا۔ کالو کا بے ہوش جسم بشکل سیٹوں کے نیچے گھٹا گیا۔ راستے بھر جنادوسری طرف منہ پھیرے بیٹھی رہی۔ اُس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ جویلی پہنچے تو ایک اور وحشتناک خبر میری منظر تھی۔ نامعلوم افراد جویلی میں داخل ہو کر انیسٹر قربان علی کو قتل کر گئے تھے۔ میں جویلی پہنچا تو انیسٹر کی لاش میرے کمرے میں میرے ہی بستر پر پڑی تھی۔ اُس کے جسم پر پانچ جگہ گولیوں کے نشانات تھے۔ مرتے مرتے بھی انیسٹر نے دیوار سے لگتے ہوئے ریو اور دیوار تک پہنچنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوا تھا۔ دونوں پولیس والوں نے بھی حملہ آوروں پر گولیاں چلائی تھیں لیکن اُن کا کوئی شخص زخمی نہیں ہوا تھا۔ جویلی کے اندر اور باہر بے شمار لوگ جمع تھے۔ مقامی تھانے کے اہلکار بھی پہنچ چکے تھے۔ یہ میرے لئے ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ انیسٹر قربان علی میرا ساتھی ہی نہیں دوست بھی تھا۔ چند روز بعد بیچارے کی شادی ہونے والی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے مجھے قتل کر دیا گیا ہو۔ رات پچھلے پہر ام ترس سے ایس پی صاحب بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے خاص طور پر مجھ سے ملاقات کی اور میری ڈھارس بندھانے کی کوشش کی۔ حالات سے صاف ظاہر تھا کہ حملہ آوروں نے جو بلاشبہ منوج اور اُس کے آدمی تھے، مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔۔۔۔۔ اگر میں شدید طور پر زخمی نہ ہوتا تو شاید اُسی وقت ریو اور لے کر قاتلوں کی تلاش میں نکل جاتا لیکن پیٹوں میں جکڑا ہوا میرا بازو مجھے کچھ انتظار پر مجبور کر رہا تھا۔ اگلے روز شام تک انیسٹر قربان علی کی تجہیز و تکفین مکمل ہو گئی تھی۔ میں آنکھوں میں رنج و الم کے ناقابل فراموش منظر سمیٹ کر جویلی میں آ گیا۔ ایس پی صاحب نے بہت کہا کہ میں

اور مجھے ساتھ لیا ہوا زمین پر گر گیا۔ باتیں بازو میں شدید ٹیس محسوس ہوتی۔ ٹوٹا ہوا شیشہ ہڈی تک گوشت میں گھس گیا تھا۔ غصے سے بے تاب ہو کر میں نے سُر کی زوردار ٹکڑا اُس کے منہ پر مار دی۔ اُس کی گرفت ڈھیلی ہوتی اور میں نے اُسے اٹھا کر نیچے کر لیا۔ تب احساس ہوا کہ میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں پستول کہیں گر چکا تھا۔ اُس وقت کاٹو نے دونوں ٹانگیں میرے پیٹ پر جابتیں اور مجھے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ میں جنا کے قریب جا کر گرا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور سہمی ہوئی یہ تناشا دیکھ رہی تھی۔ میرے کھڑے ہوتے ہی کاٹو پہلوؤں کے انداز میں اُچھلا اور اس کی دونوں ٹانگیں بھر پور قوت سے میرے سینے پر پڑیں۔ میں جیسے اڑتا ہوا جھاڑیوں میں جا گرا۔ حریف توقع سے زیادہ طاقتور اور پھرتیلا تھا۔ میں سوچ رہا تھا مجھے فوراً اپنا پستول استعمال کرنا چاہیے تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے حواس بجا کئے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کاٹو جھاڑیاں ہٹاتا ہوا میرے قریب پہنچا۔ وہ نہایت غلیظ گالیاں بک رہا تھا اور جنانے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا تھا۔ جھاڑیوں میں گھسنا کاٹو کے لئے قیامت بن گیا۔ میں نے ایک جھاڑی کی شاخ سے لٹک کر دونوں بوٹ پوری قوت سے اُس کے منہ پر چماتے وہ ڈکراتا ہوا خالی جگہ پر جا گرا۔ میرے وزن سے جھاڑی کی شاخ ترخ گئی تھی۔ میں نے زور لگا کر شاخ توڑ لی اس سے پہلے کہ کاٹو اٹھتا میں اُس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ سر پر لگنے والی دو بھر پور ضربوں نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔۔۔۔۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے۔ بازو کا زخم میری توقع سے کہیں بڑھ کر تھا۔ آستین بُری طرح خون میں پڑ چکی تھی۔ بہر حال میں ایک لڑکی کے سامنے کسی قسم کی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس کا بازو پکڑا اور جھاڑیوں میں سے راستہ بنانا ہوا تاہم

اب تھانے واپس آجاؤں لیکن میں نے انہیں مجبور کر کے حویلی میں ڈیوٹی لگوائی۔ جو کمانی شروع ہوتی تھی اُسے انجام تک پہنچانے بغیر چھوڑ دینا اب میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں انسپکٹر ترقیان علی کے قاتلوں کو جلد از جلد کیفر کر داتا کہ پہنچانا چاہتا تھا۔ اُن کی جبرتناک مزاحیہ میرے زخموں پر مرہم رکھ سکتی تھی۔ اور زخموں کے مرہم کے لئے مجھے زخم مندمل ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

حویلی پر پولیس کا پہرہ موجود تھا۔ میرا بازو آہستہ آہستہ قابل حرکت ہو رہا تھا۔ ایک دن میں انسپکٹر ترقیان علی کی چھوڑی ہوتی فال کا مطالعہ کر رہا تھا۔ بلال شاہ چارپاتی پر بیٹھا میری ٹانگیں دبا رہا تھا۔ اتنے میں حویلی کی بوڑھی خادوم کی شکل نظر آئی۔ اس نے بتایا کہ ”بی بی“ آپ کو بلا رہی ہیں حویلی میں ایک ہی بی بی تھی یعنی جنا۔ میں سوچنے لگا جتنا کونجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ شدید زحمتی ہونے کے باوجود اس نے ایک بار بھی میرا حال دریافت نہیں کیا تھا۔ کسی بات پر معذرت نہیں کی تھی، شکریہ ادا نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اب بھی مجھے اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ کاٹو والے واقعے کے بعد صرف ایک دفعہ اُس سے میری بات ہوئی تھی اور وہ بھی نانگے پر آتے ہوئے راستے میں۔ میں نے کہا تھا ”جنا دیوی! جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے یہ اُس شخص کی آہ کا نتیجہ ہے جس پر تم نے جھوٹی ہمت لگا کر بے عزت کیا تھا۔ اگر تم میں ذرا بھی احساس ہے تو اُس شریف انسان کو ڈھونڈو اور اس کے قدموں میں گر کر معافی مانگو۔ وہ خاموشی سے دوسری طرف دیکھتی رہی تھی۔

میں اسی ادھیڑ بن میں خادوم کے ساتھ چلتا ہوا حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہوا۔ مجھے جنا کے کمرے کے سامنے چھوڑ کر خادوم چلی گئی۔ میں نے کھٹکار کر اپنی آمد کی اطلاع دی اور پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ جنا پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اُس کا رخ دوسری طرف تھا۔ میں نے ایک بار

پھر کھٹکار کر اُسے متوجہ کرنا چاہا لیکن وہ بدستور منہ پھیرے بیٹھی رہی۔ کیا بات ہے جنا دیوی؟ میں نے دیوی کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اُس نے منہ پھیرے بغیر ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ کاغذ پر لکھا تھا۔

”پیاری جینی! حویلی میں میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ صرف اور صرف اُس بدنیت انسپکٹر کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اُس نے تمہارا جان کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور وہ اُس کے اشاروں پر نالچ رہے ہیں۔ میں زیادہ صفائیاں پیش نہیں کروں گا صرف اتنا کہوں گا کہ بڑا سنگھ سے نہ میرا تعلق تھا نہ ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں اور اس بات کی گواہی تمہارا دل بھی دے گا۔ اپنے دل کی گواہی پر بھروسہ کرو، دنیا کی باتوں پر نہ جاؤ۔ میں آج رات حویلی میں آ رہا ہوں۔ تمہیں ہمیشہ کے لئے یہاں سے لے جانے کے لئے تم نے بڑے منشی کو نکال کر اچھا کیا ہے۔ اب تم آسانی سے اپنا حق اپنے ساتھ لاسکتی ہو۔ سامان باندھ کر تیار رہنا۔ میں آج رات تمہیں اس جہنم سے بہت دور لے جاؤں گا اور اُن آج کی رات اُس انسپکٹر کے بچے کی آخری رات ہوگی۔ اس دفعہ ہمارے پیار کا دشمن ہمارے انتقام سے نہیں بچ سکے گا۔“

میں نے خط دوسری بار احتیاط سے پڑھا پھر جنا سے پوچھا ”اب مجھ سے کیا چاہتی ہو جنا دیوی؟“

جواب دینے کی بجائے وہ ایک دم اٹھی ایک نظر میری طرف دیکھا اور بھاگ کر میرے قدموں میں گر گئی۔ میں اس اچانک حملے سے گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ گھٹنوں میں منہ چھپاتے اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ کچھ دیر میں تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا پھر آگے بڑھ کر اُسے شانوں سے اٹھایا۔ انسپکٹر صاحب! مجھے معاف کر دیں، وہ ہاتھ جوڑتے

”کیا آپ کو یقین ہے کہ منوج، بوٹا سنگھ سے ملا ہوا ہے؟“
 ”ہاں جی، میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ اگر تمہیں کوئی شک ہے تو وہ بھی آج رات
 رُفیع ہو جائے گا۔“

رات پر سکون تھی۔ گاؤں کے لوگ دن بھر کی محنت کے بعد بیٹھی میند سو رہے
 تھے۔ دُور چوکیدار کی آواز آرہی تھی ”جاگدے رہنا“ میں ہنسا کر کہیں اُس کا تہہ نہ پیا در
 اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ عقب میں کھٹنے والی کھڑکی میں سرخ رنگ کا ایک دوپٹہ پھڑپھڑا رہا تھا۔
 کھڑکی سے آنے والی چودھویں کے چاند کی کرنیں کمرے میں اندھیرے اُجالے کا پُراسرار کھیل
 کھیل رہی تھیں۔ منوج نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ اگر جتنا جانے کے لئے تیار ہو تو کھڑکی میں
 اپنا دوپٹہ باندھ دے۔ منوج کی ہدایت کے مطابق دوپٹہ موجود تھا..... اور منوج کو اُس
 کے انجام کی طرف بلا رہا تھا۔ اُس وقت گیارہ کا عمل ہو گا جب دروازے سے ”چرچر“ کی
 آواز سنائی دی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دو گھنٹے سے میں اسی آواز کا انتظار کر رہا
 تھا۔ قدموں کی دبی دبی آہٹ اور کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ ہماری توقع کے
 عین مطابق آنے والا مافظوں کی نظر سے بچنے کے لئے دروازے کی طرف سے آیا تھا۔
 جونہی میں نے جسم پرتنی ہوئی چادر میں حرکت محسوس کی..... میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میرا
 ایک ہاتھ نوادار کی گردن سے لپٹ گیا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کا ریوڑ قابو
 میں کر لیا۔ حملہ آور اس اچانک افتاد سے پہلے تو بڑی طرح گھبرا یا لیکن پھر سنبھل گیا۔ اُس کے
 جسم میں وحشی گھوڑے کا سا زور تھا۔ میں اس کے قد کاٹھ سے پہچان چکا تھا۔ وہ منوج ہی
 تھا۔ وہ مجھے کھڑکی کے انداز میں گھسیٹا ہوا عقبی کھڑکی تک لے گیا۔ پھر عین کھڑکی پر پہنچ کر
 وہ کلا چھارہ چینا۔ بوٹے..... بوٹے..... سائیں..... لاکھے..... وہ ساتھیوں کو

ہوتے ہوئے بولی ”میں آپ کو غلط سمجھتی تھی۔ میں نے آپ کی بہت بے عزتی کی ہے“ اب وہ
 باقاعدہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا شانہ چھتیا یا اور تسلی دینے کی
 کوشش کرنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ میرے سامنے کُرسی پر بیٹھی تمام بات بتا رہی تھی۔
 اُس نے اعتراف کیا کہ وہ آج رات گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ کمرے میں پڑے چار
 بڑے بڑے صندوق اُس کی بات کی تصدیق کر رہے تھے۔ اُس نے کہا۔

”انیکٹری میں کتنی ہی بُری سہی لیکن احسان فراموش نہیں۔ آپ کا احسان زندگی بھر
 میرے دل پر نقش رہے گا۔ آپ نے جان پر کھیل کر ایک بے بس اور مجبور لڑکی کی
 عزت بچائی تھی۔ وہ لڑکی آپ کو کیسے موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ کبھی نہیں۔“ وہ
 پھر سسکیاں لینے لگی ”انیکٹری میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا، آپ جو کہیں گے میں
 ویسا ہی کروں گی..... آپ کے کہنے پر میں اندھے کنویں میں بھی چھلانگ لگا دوں گی،
 یقین نہیں تو آزما کر دیکھ لیں۔“ وہ دوپٹے کا کنارہ منہ میں دبائے زار و قطار رو رہی تھی۔

میں نے اُسے تسلی بخشی دی۔ جب وہ ذرا پُر سکون ہوتی تو میں اُسے رات کے متعلق
 ہدایات دینے لگا۔ وہ منوج سے سخت خوف زدہ نظر آرہی تھی۔ اُس کا کہنا تھا وہ ہٹ
 کا بڑا پچکا ہے۔ اُس نے آپ کو قتل کی دھمکی دی ہے اور وہ اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے
 کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں آج رات کے لئے کہیں روپوش ہو جاؤں
 یا پھر مدد کے لئے پولیس کے اور آدمی منگوا لوں۔ میں نے اُسے کہا کہ پہلی بات تو میرے لئے
 کسی صورت قابل قبول نہیں۔ ہاں اُس کے دوسرے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں
 گا۔ لیکن اضافی پولیس منوج کے لئے نہیں بوٹا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے لئے ہوگی۔
 وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

آوازیں دے رہا تھا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے مکانات کی اوٹ سے دو تین جلتی ہوئی مشعلیں برآمد ہوئیں اور گھوڑوں کی ٹاپیں بٹاسنگھ کی آمد کی خبر سنانے لگیں۔ لیکن مجھے ان لوگوں کی پرواہ نہیں تھی۔ اُن سے بٹنے کا پورا انتظام موجود تھا۔ حویلی کے اندر کوئی میں پولیس والے گھات لگاتے بیٹھے تھے۔ میں نے اپنی توجہ منوج کی طرف مرکوز کر دی۔ وہ اپنے ہانڈو کی پوری طاقت لگا کر دیوالور کا رخ میری طرف موڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کام کر رہے تھے لیکن میرا ایک ہاتھ زخمی تھا۔ ایک لحاظ سے یہ ایک ہاتھ اور دو ہاتھوں کا مقابلہ تھا۔ کوئی آدھ منٹ تک یہ جان لو اکش کش جاری رہی لیکن پھر آہستہ آہستہ دیوالور کا رخ میری طرف مڑنے لگا۔ منوج کے دماغ میں ایک ہی سودا سما رہا تھا۔ وہ طاقت کے لیے پُر زور دیوالور کا رخ میری طرف پھرنا چاہتا تھا لیکن اس ضد میں وہ ایک بات بالکل غور و خوض کر چکا تھا..... وہ بالکل کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ عین اس وقت جب دیوالور کی نالی میری گردن پر چھنے لگی تھی۔ میں نے جھٹکے سے منوج کو پیچھے کی طرف دھکیلا وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹکرایا اور آلٹ کر دوسری منزل سے بیس فٹ نیچے پلے فرش پر جا گرا۔ اُس کی آخری چیخ بڑی بھیانک تھی۔ فرش پر گرتے ہی اُس کا منکا ٹوٹ گیا تھا۔ نیچے زمین کے خالی قطعے پر زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ پولیس والوں نے بٹاسنگھ اور اُس کے ساتھیوں کو گھیر لیا تھا..... لیکن نہیں، بٹاسنگھ اُن کے گھیرے میں نہیں آیا تھا۔ جونہی میں نیچے جانے کے لئے واپس مڑا بٹاسنگھ کو سامنے کھڑا پایا۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا اور چمکدار آنکھیں سانپ کی طرح حرکت کر رہی تھیں۔ کئی لوگ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ وہ آنکھیں نہیں جھپکتا لیکن میرے سامنے اُس نے کئی بار آنکھیں جھپکیں اپنا بٹاسا قتلے وہ مجھ سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اُس کی عیاری

پولیس والوں میں ضرب المثل بن چکی تھی۔ اُس کی پھرتی اور چالاکی سے میں اچھی طرح واقف تھا اور ایک دفعہ زک بھی اٹھا چکا تھا۔ اس لئے اب میں تیار تھا..... بالکل تیار۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بٹا اچانک جھکا۔ قالین کا ایک کنارہ وہ ہاتھوں میں پکڑ چکا تھا۔ قدموں کے نیچے سے قالین درمی وغیرہ کھینچنے کا داؤ بہت پُرانا تھا۔ لیکن ہوشیاری سے لگایا گیا تھا اگر میں تیار نہ ہوتا تو بڑا مجھے گرا چکا تھا لیکن جونہی اُس نے قالین کو جھٹکا دیا میں ہوا میں اُچھل گیا۔ بٹا اپنے زور میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا میرے بوٹ کی دو زور دار ٹھوکریں اُس کے منہ پر پڑیں اور وہ چاروں شانے چپت ہو گیا۔

”سارے پولیس والے ایک سے نہیں ہوتے“ میں نے اُس کے ہاتھوں سے خنجر چھینتے ہوئے کہا۔ وہ زمین پر پڑا خون تھوکتا رہا۔

جاگیردار کی صحت یابی کے بعد میں حویلی سے رخصت ہو گیا۔ جاگیردار کی پُر زور خواہش تھی کہ میں کچھ عرصہ اور اُن کے ہاں رُکوں۔ جتنا تو شاید یہ چاہتی تھی کہ میں ہمیشہ اپنی گارڈ کے ساتھ اُن کی حویلی میں موجود رہوں۔ ان دنوں میں اُس نے ہماری زبردست خاطر تواضع کی۔ مرغن کھانے کھا کھا کر سپاہی سست ہو گئے۔ اور بلال شاہ کی تو تکبیر بھڑکنے لگی۔ اس کا دل ذہاں اتنا لگا کہ جب ہم رخصت ہوئے تو وہ ”باقاعدہ“ آنسوؤں سے رونے لگا۔ مجھے رخصت کرنے کے لئے علاقے کے معززین سمیت بہت سے افراد جمع ہو گئے تھے لیکن جتنا اُن میں نظر نہیں آئی..... اُس کے بعد میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ امرتسر کے ایک بازار میں منشی عطا سے میری ملاقات ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ آج کل وہ جاگیردار کے پاس ہی ہے۔ جتنا بڑی کوشش

کے بعد اُسے ڈھونڈ لیا تھا اور منیت سماجت کر کے منالائی تھی۔ اس کا گیارہ سالہ
 منگیتز حالانکہ برآمد ہو گیا تھا لیکن جاگیر دار نے اُس کی شادی دہلی کے ایک ڈاکٹر سے
 کر دی تھی۔ منشی عطا کے مطابق وہ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی تھی۔ بٹا سنگھ کی موت
 کی سزا ہوئی لیکن وہ ایک بار پھر جیل توڑ کر فرار ہو گیا۔ یہ ایک علیحدہ کہانی ہے پھر
 کسی وقت آپ کو سناؤں گا۔
